سحر

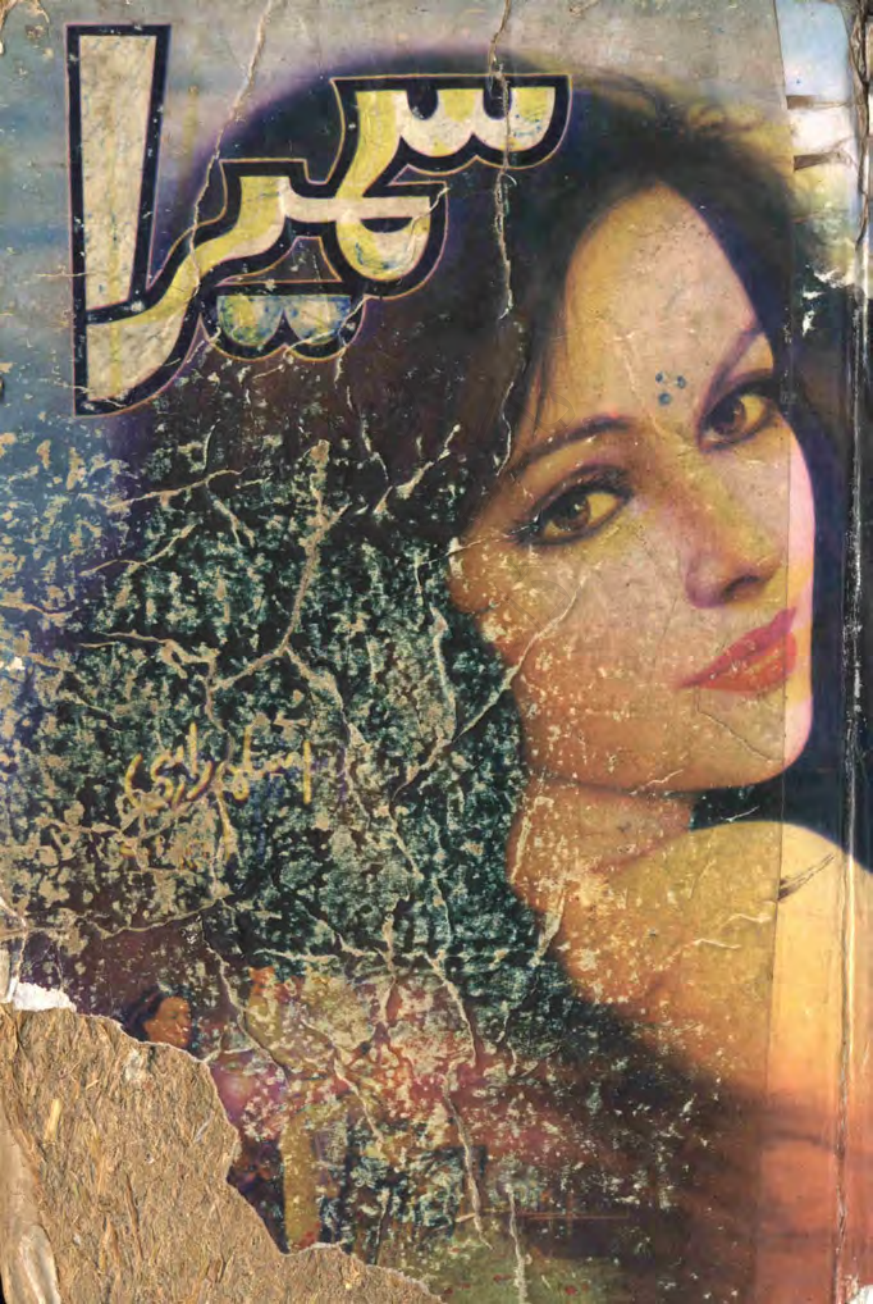

اسلم راہی

انتساب

اس کے نام جسے میں نے دل کی گہرائیوں سے چاہا۔ لیکن جب
اس کے دل کے عمق میں جھانکا تو سوائے تلخیوں اور آہوں کے کچھ نہ ملا
اور دل کے تاریک کونوں میں محبت کی ٹھنڈی ٹھنڈی آگ میں سلگتے ہوئے۔
ارماں گھائل اور مجروح ترنم سے گنگنا اٹھے ؎

یہ کس نے شاخِ گل قریب آشیاں رکھ دی
کہ میں نے شوقِ گل بوسی میں کانٹوں پر زبان رکھ دی

اسلم راہی

پیش لفظ

قبل ازیں اسلم راہی کا ایک ناول میرہ پڑھا تھا جس کی کہانی کچھ اس قدر پر تاثیر تھی کہ قاری کا ذہن مصنف کی مساعی جمیلہ کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس میں مصنف نے اپنے ادبی شوق کا پورا پورا مظاہرہ کیا ہے

اب مصنف کا نیا ناول "سمیرا" کا مسودہ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ میں یہ دیکھتے ہوئے فخر اور خوشی محسوس کر رہی ہوں کہ ناول کے خالق نے کہانی میں ایک دل پسند انفرادیت اور دل آویز جاذبیت پیدا کر کے ملک کے چوٹی کے ادیبوں میں اپنا ایک علیحدہ مقام پیدا کر لیا ہے۔

سمیرا کی کہانی کچھ اس قدر دلچسپ ہے کہ پورے ناول کا ایک ایک لفظ جاذبیت کی عمیق گہرائیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ کہانی میں کچھ ایسا انوکھا تسلسل پر حلاوت تحریر اور مضبوط فقرہ بندی ہے۔ کہ یہ سب چیزیں پڑھنے والے کو زبردستی اپنی طرف کھینچتی ہیں۔

بطور ناول نگار جہاں تک میرا ذاتی مشاہدہ ہے "سمیرا" رومانی ادب میں ایک تہلکہ انگیز اور فسوں خیز انقلاب کا باعث ہوگا۔ مصنف نے

ناول کے ہر کردار سے پورا پورا انصاف کیا ہے۔ کہانی کے آغاز سے ہی ناول کے سارے کردار سامنے آجاتے ہیں۔ اور پھر بار بار وہی کردار کچھ اس قدر خوبی اور صفائی اپنی اپنی اداکاری کے جوہر دکھاتے ہیں کہ بے اختیار مصنف کی ذہنی قابلیت اور فطرت شناسی کی تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔

اور پھر سب سے بڑھ کر مصنف نے عریانیت کو قریب تک نہیں آنے دیا۔ حالانکہ آج کے بہت سے ناول نگار عریانیت کو کامیابی کا ایک حربہ سمجھ کر استعمال کرتے ہیں۔ اس کے باوجود مصنف نے کہانی میں کچھ ایسا ہی اور مٹھاس گھول دی ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اور یہی اس ناول کی کامیابی کی وجوہات ہیں جن کے لئے اسم راہی جیسے جوان سال مصنف کی کوشش قابل ستائش ہے۔ مجھے قوی امید ہے۔ قارئین اس ناول کو بے حد پسند کریں گے۔

شیریں گل درانی

نوائے بیقرار

اپنے چند عزیزوں، قریبی دوستوں اور بہت سے بک سیلرز کے خطوط سے مجبور ہو کر میں نے چند سطور لکھنے کا ارادہ کیا ہے جنہوں نے مجھے کہا ہے کہ میں اپنے ناول کسی لڑکی کے نام سے چھپواؤں کیونکہ آج کل مارکیٹ لڑکیوں کی ہے۔ اس کے لئے سب سے میری ایک عرض ہے کہ یہ دھوکا دہی مجھ سے نہ بن پڑے گی۔ میں جب تک ناول لکھوں گا وہ میرے نام ہی سے چھپیں گے ہاں اگر کبھی جنس تبدیل ہو گئی تو علیحدہ بات ہے اور پھر یہ میرا ذریعہ معاش بھی تو نہیں کہ میں کسی دوسرے مصنفین کی طرح اپنے ناول کسی لڑکی کے نام سے چھپواؤں۔ میرا اپنا پیشہ تو سپہ گری ہے اور ناول نگاری تو بے قرار دل کی بے چین کر دینے والی دھڑکنوں۔ کی ایک صدائے بازگشت ہے کیونکہ زندگی کی پر پیچ اور کٹھن راہ گزر پر ایک ایسی ٹھوکر کھائی تھی۔ جس سے زیست کی ساری آرزوئیں اور ارمان دھواں بن بن کر دل کے ویران صحرا کے تپتے ہوئے بگولوں کی طرح اڑنے لگے۔

کافی عرصہ تک دبی ہوئی آگ کی طرح سلگتے ہوئے دل کو لئے اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ آخر قلم کا سہارا لیا اور دل میں اٹھتے ہوئے خیالات کے بگولوں کو الفاظ کا روپ دے کر بردوست کا سامان مہیا کیا۔ میں اپنی اس کوشش پر مطمئن بھی ہوں اور خوش بھی کیونکہ اس طرح میری یادکہنہ کے ناسور رفتہ رفتہ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ اب اس موقع پر اگر مجھے کوئی کہے کہ میں لڑکی کے ہاتھ اپنے ناول چھپواؤں تو ایسی اُمید مجھ سے ناممکن ہے۔

میں نہ تو کوئی سخن تراش ہوں اور نہ صاحب قلم۔ بس یہ تو دل کے سکون کا ایک سامان ہے میں یہ فیصلہ قارئین کرام پر چھوڑتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ اگر انہوں نے میرے نام سے ناول قبول نہ کئے تو میں نے اپنے محسن میں اس شعر کے سے جذبات لے کر داخل ہوا تھا۔

خدایا یہ حقیقت ہے کہ ہے اک خواب کی دُنیا
نظر آتی ہے مجھے اک انجم و مہتاب کی دُنیا

مجرم ترنم سے یہ گنگناتا ہوا۔ کنارہ کش ہو جاؤں گا۔

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

اُمید واثق ہے کہ قارئین مجھے اپنے نیک مشوروں سے نوازیں گے۔

اسلم راہی

اقبال گنج۔ گجرات

موسم سرما کی سرد اور طویل رات تھی۔

شہر کا گھنٹہ گھر رات کے بارہ بجا چکا تھا۔ تیز اور تند ہوائیں جنگل اور پہاڑوں میں سنسناتی ہوئیں ماحول کو اور زیادہ بھیانک بناتے ہوئے تھیں سطح فلک پر بڑی تیزی سے دوڑتے ہوئے سیاہ اور سرمئی رنگ کے بادل جب کبھی کبھی گرجتے تو فضائیں خوف اور دہشت سے کانپ سی جاتیں۔ مگر تاریک رات کسی کی پرواہ کئے بغیر بڑی تیزی سے ظلمتی کی گہرائیوں میں بڑھتی چلی گئی۔

آتنی رات گئے شمیم جب سول ہسپتال کی عمارت سے باہر نکلا تو فضا میں ہلکی ہلکی بوندا باندی ہونے لگی تھی۔ ہسپتال کے صحن میں بڑ کے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اس نے اپنے سامنے گورنمنٹ کالج فار ویمن کی طرف دیکھا۔ عمارت جہاں کچھ دیر قبل مشاعرہ کی وجہ سے گہما گہمی تھی اب تاریکی میں ڈوب چکی تھی۔ کچھ دیر وہ حامد وساکت کھڑا عمارت کو گھورتا پھر کچھ سوچتے ہوئے اپنے کبودی رنگ کے اوورکوٹ کے کالر کانوں تک چڑھانے کے بعد ہسپتال کے بیرونی گیٹ سے باہر آیا اور گردن جھکائے آہستہ آہستہ سرکلر روڈ کے فٹ پاتھ چلتا ہوا ایک طرف بڑھنے لگا۔

سارے بازار بند ہونے کی وجہ سے شہر میں قبرستان کا سا سکوت تھا صرف سڑک پر کبھی کبھی کوئی تانگہ نمودار ہوتا۔ جس کے سست رفتار گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز تھوڑی دور تک فضا میں ارتعاش پیدا کرنے کے بعد خاموشی کے گہرے سمندر میں ڈوب جاتی۔

دس پندرہ منٹ سرکلر روڈ پر چلنے کے بعد شمیم دائیں طرف ایک تنگ گلی میں مڑ گیا اور ابھی وہ بمشکل چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ ایک دروازے کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ ایک پُردرد نسوانی آواز سن کر ایک دم رک گیا اور کوٹ کے کالر نیچے گراتے ہوئے دروازے کے قریب جا کھڑا ہوا۔

خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے آبرو نہ کرو۔ آواز کسی نوجوان لڑکی کی تھی۔

شمیم آگے بڑھا اور دروازے کے ساتھ کان لگا کر سننے کی کوشش کرنے لگا۔

تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد ایک بھاری اور کرخت آواز سنائی دی۔ تم جیسی کئی حسین کلیاں یہاں آکر کانٹوں سے اپنا دامن بچانے کی خاطر یہی الفاظ کہتی ہیں۔ لیکن مجھ پر ایسی التجائیں کوئی اثر نہیں رکھتیں خاموشی سے آگے بڑھ کر میری پیاسی گود میں سمٹ جاؤ۔ ورنہ میں تمہیں اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ کر صرف چند لمحوں کے لمس کے بعد ایک منہ بند کلی سے خوب صورت اور شگفتہ پھول میں بدل دونگا۔

کمرے میں پھر سکوت چھا گیا۔ لیکن فرش پر جب کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی تو لڑکی کی لرزتی ہوئی آواز پھر گونجی۔

میں کہتی ہوں وہیں رک جاؤ ورنہ ..... اس سے آگے اس کی سانس پھول گئی۔

جواب میں کسی نے ایک مکروہ قہقہہ بلند کرتے ہوئے کہا۔

ورنہ ..... ورنہ تم جان دے دوگی۔ یہی نا۔ لیکن یاد رکھو .... میں تمہاری یہ آرزو کبھی پوری نہ ہونے دوں گا۔

چند قدم جب کوئی اور آگے بڑھا تو لڑکی کی ایک دلدوز چیخ بلند ہوئی

لیکن جلد ہی وہ کچھ اس طرح خاموش ہوگئی جیسے کسی نے اس کے منہ پر
ہاتھ رکھ دیا ہو۔

شمیم نے دروازے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے پیچھے دیکھا۔ دروازہ اند
سے بند تھا۔ وہ پریشان سا ہوگیا۔ اور ہتھیلی پر ٹھوڑی جماتے ہوئے کچھ
سوچنے لگا۔ کوئی آخری فیصلہ کرتے ہوئے وہ ایک دم پیچھے ہٹا اور
اس زور سے دروازے کو دھکا دیا کہ دونوں پٹ ٹوٹ کر فرش پر گرے
اور بلا جھجک اندر داخل ہوگیا۔

کمرے کے دائیں کونے میں ایک بھاری بھرکم، دراز قامت اور
سیاہ فام جوان ایک بھرے بھرے اور سُرخ و سفید جسم والی نوخیز اور
بے حد حسین لڑکی کو بڑی بے رحمی سے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑے
ہوئے تھا۔ شمیم کو دیکھتے ہی اس نے لڑکی کو چھوڑ دیا۔ اپنے کوٹ کے
اندر سے ایک چمکتے ہوئے پھل والا خنجر نکالا اور اسے ہوا میں اوپر
پھینک کر بڑی ہوشیاری سے پھر پکڑتے ہوئے زور سے غرایا۔

کون ہو تم؟

شمیم آگے بڑھا اور کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر جواب میں
کچھ کہنے کے بجائے خاموشی سے ٹکٹکی باندھ کر اس کی طرف دیکھنے
لیکن وہ اپنے سوال کا جواب نہ پا کر پھر گرجا۔

جان سلامت چاہتے ہو تو فوراً کمرے سے نکل جاؤ۔ ورنہ صبح

تمہاری لاش بھی کہیں نہ ملے گی۔

شمیم چند قدم اور آگے بڑھا اور بڑی طمانیت سے کہا۔

ایک بے بس اور کمزور لڑکی کی ناموس کو لوٹتے ہوئے تمہیں شرم
آنی چاہیئے۔ چھوڑ دو اسے۔

اُس نے بھی آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

تم کون ہوتے ہو مجھے پند و نصیحت کرنے والے۔ چلے جاؤ یہاں
سے شمیم وہیں جما رہا۔ اور جب وہ اپنے دائیں ہاتھ میں خنجر لئے آہستہ
آہستہ آگے بڑھتا ہوا اس سے ذرا قریب ہوا۔ شمیم نے فوراً اپنا کوٹ اتار
کر اس کے خنجر کے اوپر پھینک دیا پھر بلک جھپکنے میں آگے بڑھ کر اس
کے ہاتھ سے خنجر چھیننے کے بعد اس اندھا دھند مکے برسانے لگا۔

شمیم کے دو تین فولادی گھونسے کھانے کے بعد وہ سنبھل گیا
اور جواب میں وہ بھی شمیم پر مکوں کی بارش کرنے لگا۔ دونوں پانچ منٹ
تک تابڑ توڑ ایک دوسرے کو رسید کرتے رہے۔ آخر شمیم اپنے مدمقابل
کو نڈھال کرنے میں کامیاب ہوگیا اور پھر اسے اپنے دونوں ہاتھوں
پر اٹھا کر کمرے کے ایک کونے میں پٹخ دیا۔

فرش پر گرنے کے بعد اس نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش نہ کی اور وہیں
پڑا بیٹھے کسی بوڑھے بھینسے کی طرح ہانپنے لگا۔ شمیم چند لمحے اس کے پاس
کھڑا رہا۔ پھر واپس مڑا اور کمرے کے وسط میں پڑا ہوا اپنا اوور کوٹ

پہنچنے کے بعد اس لڑکی سے قریب ہوتے ہوئے بڑے نرم لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

کون ہو تم؟

اس نے بدحواسی میں جواب دیا۔

جی ..... مَیں ....

شمیم اس کی بات کاٹتے ہوئے پھر بولا۔

آؤ میرے ساتھ ورنہ اس کا کوئی ساتھی تمہارے لئے پھر مصیبت بن جائے گا۔

وہ منہ سے کچھ کہے بغیر شمیم کے ساتھ کمرے سے باہر آئی اور پیچھے تو پیچھے سے تکمکارا اور نہایت سخت آواز سنائی دی۔

دونوں خاموشی سے گلی میں آگے پیچھے چلنے لگے۔ گلی کا ایک موڑ مڑتے ہوئے شمیم نے پیچھے دیکھ کر اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تھی کہ ٹھٹک کر رہ گیا دو آدمی سیاہ لمبے کوٹ پہنے دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے صرف چند قدم کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ اس نے بڑی تیزی سے کچھ سوچا ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ شمیم نے ابھی صرف چند لمحے تک ہی لڑکی کے کان کے قریب منہ لے جاتے ہوئے سرگوشی کی۔

مڑ کر پیچھے دیکھا تھا کہ لڑکی فکر انگیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

کیا بات ہے؟

شمیم نے فوراً چونکتے ہوئے کہا۔

وہ دیکھو دو آدمی ہمارا تعاقب کر رہے ہیں۔

لڑکی مڑ کر پیچھے دیکھنے لگی۔ پھر اپنا رُخ شمیم کی طرف کرتے ہوئے ڈوبتی ہوئی آواز میں بولی۔

اب کیا ہوگا؟

شمیم نے اسے تسلی دینے کے انداز سے کہا۔

تم فکر نہ کرو میرے ساتھ ساتھ تیزی سے چلو۔ میں ان سے بھی نمٹ لوں گا۔

دونوں پھر آگے بڑھنے لگے۔

لیکن جب وہ ایک پرانے اور ٹوٹے پھوٹے تالاب کے قریب پہنچے تو پیچھے سے تکمکارا اور نہایت سخت آواز سنائی دی۔

اے! ٹھہر جاؤ۔

شمیم نے جب مڑ کر پیچھے دیکھا تو تعاقب کرنے والے اس سے صرف چند قدم کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ اس نے بڑی تیزی سے کچھ سوچا تم دیوار کے ساتھ جا کر کھڑی ہو جاؤ تاکہ وہ تمہیں ضرر نہ پہنچا سکیں۔

لڑکی چپ چاپ بڑی تیزی سے ایک قریبی دیوار کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔

شمیم پھر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ دونوں اپنے اپنے دائیں ہاتھ میں ایک ایک لمبے پھل کا چاقو لئے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر انہوں نے وہیں

کھڑے کھڑے بڑی رازداری سے آپس میں کچھ کھسر پھسر کی پھر کوئی آخری فیصلہ کرنے کے بعد ایک ساتھ شمیم کی طرف بڑھنے لگے۔ لیکن وہ بھی چوکس کھڑا تھا۔ فوراً لپک کر قریب ہی پڑا ہوا ایک وزنی پتھر اٹھایا اور پوری قوت سے ان کی طرف دے مارا۔

سنگلاخ اور نوکیلا پتھر ان میں سے ایک کے سر پر لگا وہ چیخ مار کر زمین پر بیٹھ گیا اور اس کے سر سے سرخ سرخ اور گرم خون کا سوتا پھوٹ نکلا۔ دوسرا فوراً اپنے زخمی ساتھی کی طرف لپکا شمیم بروقت موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پھرتی سے آگے بڑھا اور اس کے ہاتھ سے چاقو چھین کر اس کے چہرے، گردن اور پیٹ پر لگاتار کسی خودکار ہتھیار کی طرح کئی مکے برسا دیئے تعاقب کرنے والا اپنی گردن اور پیٹ سہلاتا ہوا واپس بھاگ کھڑا ہوا۔ شمیم اب اس کے زخمی ساتھی کی طرف بڑھا لیکن وہ پہلے سے ہی موقع کی تلاش میں تھا۔ جونہی شمیم کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے ساتھی کے پیچھے بھاگ نکلا۔

شمیم پھر لڑکی کو ساتھ لے کر آگے بڑھنے لگا۔ گلی کے دو تین موڑ مڑنے کے بعد وہ ایک مکان کے سامنے رکا اور مقفل دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ لڑکی تذبذب کے عالم میں ابھی تک باہر ہی کھڑی تھی۔ صحن میں چند قدم آگے بڑھنے کے بعد شمیم رکا اور واپس مڑ کر لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔

ارے! تم باہر کیوں کھڑی ہو گئیں۔ یہ ان بدمعاشوں ایسے کسی آدمی کا مسکن نہیں۔ میرا گھر ہے۔ آجاؤ اندر۔ یہاں تمہیں کسی قسم کا خطرہ نہیں۔

لڑکی کچھ ہچکچائی۔ پھر تھکے تھکے قدموں سے اندر داخل ہو گئی۔

شمیم نے لائٹ آن کی پھر لڑکی کو ساتھ لے کر ایک کمرے میں داخل ہوا اور اُسے ایک صاف ستھرے بستر پر بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ لڑکی چپ چاپ مسہری پر بیٹھ کر کمرے کی ہر چیز کا جائزہ لینے لگی ساتھ والے کمرے میں تھوڑی دیر بعد اسٹوو جلنے کی آواز سنائی دی۔ لیکن وہ کسی اور طرف دھیان دینے کی بجائے اسی طرح کمرے میں اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔ جو سوائے ایک بیڈ سائڈ ٹیبل اور کرسی کے ہر طرح کے فرنیچر اور دوسرے آرائشی سامان سے بالکل خالی تھا۔

دفعتاً کمرے باہر کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ لڑکی سنبھل کر بیٹھ گئی اور شمیم ایک ہاتھ میں گرم گرم دودھ سے بھرا ہوا بڑا سا چینی کا ایک پیالہ اور دوسرے ہاتھ میں لمبے لمبے کیکوں سے بھری ہوئی ایک پلیٹ اٹھائے اندر داخل ہوا۔

دونوں چیزیں اس نے بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھ دیں اور پھر میز اٹھا کر اس کے سامنے رکھتا ہوا کسی قدر شرمندگی سے کہنے لگا۔

معاف کرنا میں اس وقت بس یہی مہیا کر سکا۔ تم کھاؤ میں تھوڑی دیر تک آتا ہوں۔

لڑکی کچھ سنبھلی پھر شمیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔ مجھے بھوک نہیں۔

شمیم نے بلا توقف کہا۔

اس میں تکلف کی کون سی بات ہے۔ کھالو ویسے بھی سردی ہے گرم گرم دودھ پینے سے تمہاری طبیعت کھل جائے گی۔

بات ختم کرتے ہی شمیم واپس مڑا اور بڑی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ لڑکی تھوڑی دیر چپ چاپ بیٹھی رہی پھر پلیٹ سے چند کیک اٹھائے اور سارا دودھ گھونٹ گھونٹ پینے کے بعد میز اٹھا کر ایک طرف رکھ دی اور دوبارہ بستر پر بیٹھ کر جانے کن الجھنوں میں کھو گئی۔

شمیم تھوڑی دیر بعد کمرے میں داخل ہوا اور کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کچھ سوچنے لگا۔ اس درمیان لڑکی نے اپنا سر جھکائے رکھا۔ آخر شمیم کی نہایت دھیمی اور شرافت میں ڈوبی ہوئی آواز کمرے کی فضا میں بلند ہوئی۔

تمہارا نام کیا ہے؟

لڑکی نے اپنا سر اوپر اٹھا کر ایک دفعہ اسے گہری نگاہوں سے دیکھا پھر ہلکے سے کہا۔

سمیرا۔

کہاں رہتی ہو؟

اقبال گنج

تم ان بدمعاشوں کے ہتھے کیسے چڑھ گئیں؟

ہمارے کالج میں آج مشاعرہ تھا۔ میں مشاعرے سے گھر واپس لوٹ رہی تھی کہ ایک کار میرے پاس آکر رکی اس میں تین آدمی بیٹھے تھے۔ ایک کار میں بیٹھا رہا۔ دو بڑی پھرتی سے نیچے اترے اور مجھے اس قدر تیزی سے دبوچ کر کار میں پھینک دیا کہ اپنے دفاع کے لئے کوشش کرنا تو کجا شور تک نہ کر سکی۔

شمیم نے گہری سنجیدگی سے کچھ سوچتے ہوئے پھر کہا۔

تم مشاعرے میں اکیلی کیوں گئیں۔ اپنے کسی بہن بھائی کو ساتھ لے لیا ہوتا۔

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے کچھ سوچنے لگا۔

شمیم نے پھر پوچھا۔

تم چپ کیوں ہو گئیں۔ کیا تمہارا کوئی بھائی بہن نہیں؟

سمیرا نے چونک کر کہا۔

ہیں۔ لیکن وہ یہاں نہیں۔

تو اس کا مطلب ہے کہ تم عارضی طور پر یہاں کسی کے پاس رہ رہی ہو۔

نہیں میں یہیں کی رہنے والی ہوں۔

تو پھر تمہارے بھائی بہن کہاں ہیں۔

میری دو بہنیں ہیں۔ دونوں استانیاں ہیں بڑی ٹھٹھ اور چھوٹی نواب شاہ میں ہے۔ ایک بھائی ہے جو دونوں بہنوں سے چھوٹا اور مجھ سے بڑا ہے اور یہیں زمیندار کالج میں سیکنڈ ایئر کا سٹوڈنٹ ہے۔ آج کل کالج میں چونکہ بڑے دنوں کی چھٹیاں ہیں اس لئے وہ بہنوں سے ملنے سندھ گیا ہوا ہے۔

شمیم نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پوچھا۔

تمہارے ابا کیا کام کرتے ہیں؟

سٹیشن ماسٹر ہیں۔

ان کو ساتھ لے لیا ہوتا۔

ان کی آج نائٹ ڈیوٹی تھی۔

تم پڑھتی ہو کیا؟

حی ہاں۔

کون سی کلاس میں؟

فسٹ ایئر

تو کیا ایسے موقعوں پر تم اپنے گھر میں اکیلی ہی رہتی ہو؟

نہیں محلے میں میرے ایک چچا۔ دو ماموں ایک پھوپھی اور ان کے علاوہ اور بہت سے قریبی رشتہ دار ہیں۔ میں ایسے موقعوں پر اپنے چچا کے ہاں رہتی ہوں۔

تو اس کا مطلب ہے تمہاری امی نہیں ہیں۔

ہاں۔ وہ فوت ہو چکی ہیں۔

شمیم پھر خاموش ہو گیا۔ چند لمحوں کی سوچ و بچار کے بعد اپنے کوٹ کی جیب سے سگریٹ کیس نکال کر سگریٹ سلگایا۔ دو تین لمبے لمبے کش لئے اور فضا میں دھوئیں کا ایک بادل چھوڑتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا اور سمیرا کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت دھیمی آواز میں کہا۔

رات کافی بیت چکی ہے۔ اب تم آرام کرو۔ میں اعلیٰ الصبح تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں گا۔

شمیم کمرے سے باہر نکل گیا۔ سمیرا تھوڑی دیر خاموش بیٹھی رہی۔ پھر ایک توبہ شکن انگڑائی لیتی ہوئی آہستہ آہستہ بستر پر دراز ہوئی۔ اور تھوڑی دیر تک مختلف خیالات میں بھٹکنے کے بعد نیند سے ہم آغوش ہو گئی۔

دوسرے روز علی الصبح سمیرا غسل خانے میں منہ ہاتھ دھونے کے بعد واپس اپنے کمرے کی طرف لوٹی تو شمیم اس کے کمرے سے باہر آ رہا تھا۔ سمیرا کو دیکھتے ہی اس نے نہایت شائستگی سے کہا۔

میں نے ناشتہ آپ کے کمرے میں رکھ دیا ہے۔

سمیرا خاموش رہی۔ اور شمیم اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

ناشتہ کرنے کے بعد سمیرا نے میز اٹھا کر ایک طرف رکھ دی۔ اور مسہری پر بیٹھ کر خاموشی سے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ دس منٹ اسی طرح گزر گئے آخر شمیم کمرے داخل ہوا۔ سمیرا نے پہلی بار اُسے غور سے دیکھا اور دیکھتی رہ

گئی وہ انیس بیس برس کے لگ بھگ دراز قد اور بھرے بھرے جسم
ایک بے حد خوبصورت نوجوان تھا۔ اس نے وہی رات والا ڈریس پہن رکھا
تھا۔ جو اس کے لمبے قد پر اسے اور زیادہ پرکشش بنائے ہوتے تھا۔ سمیرا
ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتی رہی لیکن جب وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے سامنے
کرسی پر آ بیٹھا تو وہ چونک پڑی اور شرم سے نگاہیں جھکا لیں۔

شمیم کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ
رہا تھا کہ یہ لڑکی وہی ہے جسے وہ گزشتہ شب بدمعاشوں کے ہاتھوں بچا چکا تھا۔
سمیرا جسے وہ رات کے اندھیرے میں مڈبھیڑ ہونے کی وجہ سے بغور دیکھ سکا
تھا۔ اب ایک تازہ اور شگفتہ پھول کی طرح اپنے حسن کی ہر رعنائی لئے اس
کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کے سیب کی طرح بھرے بھرے اور سرخ عارض
جاذبیت میں بے پناہ اضافہ کر رہے تھے۔ اور اس کی موٹی موٹی گہری گہری
اور سیاہ آنکھیں یوں دکھائی دے رہی تھیں کہ ایک بجلی ہے جو ابھی کوند پڑے
گی۔ اور پھر ان پر جھکے ہوئے تیغ نما ابرو چشم تماشائی کو زخمی کر رہے تھے۔ اس
کی لمبی اور موٹی سی چوٹی پیٹھ پر سے ہو کر سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی اس
کی گود میں پڑی تھی۔ اور اس پر طرہ یہ کہ اس کے جاذب نظر چھاتیوں کے
ابھار، سفید سفید بازو اور سفید پنڈلی میں پھنسے ہوئے گورے گورے چکنے اور
بھرے بھرے پاؤں اسے فتنہ سے قیامت بنا رہے تھے۔ اس کے علاوہ
اس کے قیمتی لباس کی ماڈرن کٹائی۔ سلائی نے اسے حسن کی آخری منزلوں

تک پہنچا دیا تھا۔ شمیم چند منٹ ماحول سے بے خبر اسے لگاتار گھورتا رہا۔ اچانک
اسے شاید اپنی اس حرکت پر ندامت ہوئی اور سر کو ایک جھٹکا دینے کے
بعد تھوڑی دیر نگاہیں جھکائیں رکھیں۔ پھر بڑی آہستگی اور دھیمی آواز سے اس کو
مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

کیا ابھی تم گھر جاؤ گی؟

سمیرا نے گردن اوپر اٹھائی اور نگاہیں شمیم کے چہرے پر مرکوز کرتے
ہوئے کہا۔

جی

تمہارے ابا اس طرح رات باہر گزارنے سے خفا تو نہ ہوں گے۔

نہیں میں انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر لوں گی کہ رات مشاعرے میں دیر ہو
جانے کی وجہ سے میں اپنی ایک سہیلی کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی تھی۔

کمرہ خاموشی میں ڈوب گیا۔ لیکن جلد ہی سمیرا کی آواز گونجی۔

اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں۔

شمیم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

پوچھئے۔

آپ کا نام کیا ہے؟

میرا نام شمیم ہے۔

ن۔ کیا اتنے بڑے گھر میں آپ اکیلے ہی رہتے ہیں۔

نہیں میری امّی اور بہن بھی ہیں۔
لیکن وہ کہیں دکھائی تو نہیں دی۔
دراصل میری بہن بیمار ہے۔ کچھ دنوں سے وہ سول ہسپتال میں داخل ہے۔ امی بھی دن رات اسی کے پاس رہتی ہیں۔
کیا نام ہے آپ کی بہن کا؟
ثمینہ۔
پڑھتی ہے کیا۔؟
ہاں۔
کون سی کلاس میں؟
آٹھویں میں۔
آپ کے ابا کیا کام کرتے ہیں؟
شمیم اداس ہوگیا۔
فوت ہو چکے ہیں۔
سمیرا بھی اداس ہوگئی۔ کچھ دیر خاموش رہی آخر پھر بولی۔
آپ کام کیا کرتے ہیں۔
شمیم نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔
میں؟..... میں تو.... آں..... بس کچھ بھی نہیں۔
سمیرا نے اس مہمل جواب پر اسے احتجاج کی نگاہوں سے دیکھا۔ پھر

چند لمحے خاموش رہتے ہوئے بولی میں شرمندہ ہوں کہ رات آپ کے لئے مصیبت کا باعث بنی اب مجھے اجازت دیجئے میں چلتی ہوں۔
شمیم اٹھ کھڑا ہوا۔
چلئے میں آپ کو گھر تک چھوڑ آتا ہوں۔
سمیرا نے بھی مسہری سے اٹھتے ہوئے کہا۔
نہیں آپ تکلیف نہ کیجئے۔ میں اکیلی چلی جاؤں گی۔
تم میری تکلیف کا خیال نہ کرو مجھے ویسے بھی باہر جانا ہے۔
کہاں؟
سول ہسپتال۔
تو کیا آپ گزشتہ شب بھی ہسپتال سے ہی لوٹ رہے تھے۔
ہاں۔ میں اتنی رات گئے ہسپتال سے ہی لوٹ رہا تھا۔ کہ راستے میں تمہارے کام آگیا۔
سمیرا خاموش رہی۔ دونوں مکان سے باہر نکلے۔ شہر کے بڑے بازار تک دونوں اکٹھے آئے پھر سمیرا خدا حافظ کہتی ہوئی اقبال گنج کی طرف چلی گئی شمیم نے بھی سگریٹ کا ایک لمبا کش لگاتے ہوئے دھوئیں کا سفید مرغولہ کچھ اس طرح آسمان کی طرف چھوڑا جیسے اس نے پچھلی شب پیش آنے والے واقعہ کو پتنگ کی طرح ہوا میں اڑا دیا ہو۔ اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سول ہسپتال کی طرف جاتی ہوئی سڑک پر ہو لیا

۲

اس واقعہ کو کئی ماہ بیت گئے۔

سمیرا کے دل میں شمیم کے لئے جو جذبات اٹھے تھے۔ وہ کچھ عرصہ بیٹھی ہو
ٹھنڈی آگ میں سلگتے رہے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ کچھ زنگ
سا ہو گیا۔ اور سمیرا نے محض اسے ایک ہمدردی کا نام دے کر دل کے نہاں خانو
میں دفن کر دیا۔ دن کسی کا انتظار کئے بغیر اسی طرح گزرتے رہے اور سرد یا
گرمی کے انتہاء اور تیز رو ساگر میں بہہ کر ختم ہو گیا۔

گرمیوں کی وہ ایک چلچلاتی دوپہر تھی۔

سمیرا پلیٹ فارم پر سیکنڈ کلاس کے ویٹنگ روم کے باہر بنچ پر بیٹھی ہو
تھی۔ اس کے قریب ہی ایک دوسرے بنچ پر چند اور نوجوان اور بوڑھی عورتیں

بھی بیٹھی تھیں۔ دائیں طرف ذرا دور پیپل کے درخت کے نیچے چائے کے
کیبن کے پاس ایک ضرر رسیدہ اور کلین شیو صاحب ایک آٹھ دس سالہ لڑکے
کا ہاتھ تھامے کھڑے تھے جو لباس اور زبان سے مکھسوی دکھائی دیتے تھے۔
ان کے دائیں طرف چند کالجیٹ اور تین چار بوڑھے دیہاتی آپس کی خوش گپیوں
میں مصروف تھے۔

سامنے پلیٹ فارم نمبر ۲ کے پاس چند خالی ڈبے کھڑے تھے جن میں سے کئی آدمیوں
کے بری طرح شور کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اچانک ایک ڈبے میں سے
چار نوجوان آپس میں جھگڑتے ہوئے نمودار ہوئے اور ان کے پلیٹ فارم پر
اترتے ہی پانچ پانچ اور دس کے بے شمار نوٹ پلیٹ فارم پر بکھر گئے۔ سمیرا
نے جب ذرا غور سے ان کی طرف دیکھا تو چونک سی پڑی۔ شمیم بھی ان میں
شامل تھا اور باقی تین جوان اسے بازوؤں سے پکڑ کر ایک طرف کھینچ رہے
تھے۔ اچانک شمیم نے ان سب کو مضبوط جھٹکے کے ساتھ پلیٹ فارم پر گرا دیا۔ اور
پھر اپنا لباس درست کرتا ہوا آگے بڑھا۔ دران پر لگاتار گھونسوں اور لاتوں
کی بوچھاڑ کر دی۔

کچھ دیر تک شمیم ان تینوں کے ساتھ لڑتا رہا۔ اس دوران سمیرا اپنی جگہ
سے اٹھ کر بڑی پریشانی سے ان کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ پلیٹ فارم نمبر ۱ پر
کھڑے ہوئے سب مرد بھی آپس کی باتیں ختم کر کے ان کی طرف دیکھنے لگے تھے۔
چائے کے کیبن کے پاس بچے کا ہاتھ تھامے وہ بوڑھا بھی چند ثانیے تک انہیں

گہری نگاہوں سے دیکھتا رہا اور پھر کیبن کے مالک کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے غصیلے لہجہ میں کہا۔

جواری ہیں سالے جواری۔ شرم نہیں آئی ٹرین کے خالی ڈبوں میں جوا کھیلتے ہوئے قوم کے دشمن۔ دن کو جوا کھیلتے ہیں اور رات کو چوری چکاری کر کے شہریوں کی پرامن زندگی میں خلل پیدا کرتے ہیں۔

سمیرا نے جب یہ الفاظ سنے تو کانپ سی گئی اور اس کے دل سے غم اور حسرت میں ڈوبی ہوئی ایک ہوک سی اٹھی۔

تو کیا شمیم جواری ہے۔

نہیں۔ نہیں۔ وہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک شریف آدمی ہے۔ تب ہی تو اس نے مجھے ان غنڈوں کے ہاتھوں سے بچایا تھا۔ لیکن جب اس بوڑھے کے الفاظ اس کے ذہن میں گونجتے تو وہ اپنے خیالات کو جھٹلانے پر مجبور ہو جاتی

شمیم ابھی تک ان تینوں کو بڑی طرح پیٹ رہا تھا۔ ناگاہ ڈبے سے دو اور جواری نمودار ہوئے۔ اور ان میں سے ایک شمیم کی طرف داری کرتے ہوئے بڑے سخت لہجے میں ان تینوں کو مخاطب کرتے ہوئے گرجا۔

او تے! کیوں جھگڑا کرتے ہو۔ شمیم آج کی بازی جیت چکا ہے اگر تم نے اس قسم کے فضول جھگڑے کیے تو آج سے ہم سب کا تمہارے ساتھ بائیکاٹ۔

وہ تینوں رک گئے۔ شمیم نے اپنے ہاتھ روک لئے اور پھر پلیٹ فارم

پر بکھرے ہوئے نوٹ چن چن کر ردی کاغذوں کی طرح اپنی پتلون کی جیبوں میں ٹھونسنے لگا۔

تھوڑی دیر سب اکٹھے کھڑے ہو کر بڑی رازداری سے باتیں کرتے رہے جیسے آپس میں مصالحت کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر شمیم دونوں پلیٹ فارم کے درمیان لوہے کا جنگلا عبور کر کے پلیٹ فارم نمبر ۱ پر آ کھڑا ہوا۔ جب وہ چائے کے کیبن کے پاس کھڑے بوڑھے کے قریب پہنچا تو وہ بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

ارے شمیم تم ... ؟ کیا کر رہے تھے وہاں .... پھر جوا کھیلا نا تم نے ... تم کیوں اس بُری عادت سے باز نہیں آتے۔ سو بار تمہیں منع کیا ہے کہ اس بُری عادت کو چھوڑ کر کوئی باعزت دھندا شروع کرو لیکن تم ہو کہ کوئی اثر ہی نہیں لیتے۔

شمیم اپنی صفائی پیش کرنے کے بجائے ادھر اُدھر کی باتوں میں ٹال گیا۔ سمیرا دونوں کی گفتگو بڑے غور سے سننے لگی۔ جس سے ظاہر ہوا کہ وہ صاحب ایک مقامی ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہیں اور شمیم کے محلے دار ہیں۔

کئی منٹ تک وہ شمیم کو پند و نصیحت کرتے رہے۔ پھر فوراً بات کا رُخ بدلتے ہوئے پوچھا۔

ارے شمیم! وہ تمہاری بہن کی صحت کیسی ہے؟

شمیم نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے دیکھا تو مسکرا کر کہا۔

وہ چار ماہ ہوئے ٹھیک ہو چکی ہے۔

اور امی جان؟

شمیم اداس ہو گیا۔

جی۔ وہ تو ویسی کی ویسی ہی ہیں۔ ڈاکٹروں کی بتائی ہوئی ہر دوا پلا دی ہے۔ لیکن کچھ فائدہ نہیں۔

سمیرا چونک پڑی۔

تو کیا شمیم کی امی بھی بیمار ہیں۔ اف خدایا کن کن مصیبتوں میں گھرا ہوا ہے بے چارہ۔

سمیرا آگے بھی شاید سوچتی لیکن اس بوڑھے کی آواز پھر اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

شمیم! کیا سروس ملی کہیں؟

شمیم نے بڑے مغموم لہجے میں جواب دیا۔

اکرام صاحب اس دور میں مجھ سے بے سہارا آدمی کے لئے سروس کہاں۔

اکرام شاید آگے بھی کچھ کہتے لیکن اتنی دیر میں انجن کی بھک بھک کی آواز سنائی دی اور چھوٹا بچہ ان کا ہاتھ چھوڑ کر گاڑی دیکھنے کے لئے آگے بھاگا۔ پلیٹ فارم کے کنارے کھڑے ہو کر گردن دائیں طرف گھماتے ہوئے اس نے تھوڑی دیر دیکھا۔ پھر پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے زور سے چلانے لگا۔

ابو گاڑی آگئی۔ مال گاڑی ہے مال گاڑی۔

جونہی اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا رخ بدلتے ہوئے سامنے دیکھا کنارے پر کھڑا ہونے کی وجہ سے وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور پلیٹ فارم سے نیچے پٹڑی کے بل ریلوے لائن کے قریب گر گیا۔ انجن اب اس سے بمشکل گز کے فاصلے پر تھا۔ اکرام شور کرنے لگے تھے۔ اور پلیٹ فارم پر کھڑے سب مسافر پریشان دکھائی دینے لگے۔ شمیم نے جو یہ منظر دیکھا تو بھاگتا ہوا آگے گیا اور بچے کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ پلیٹ فارم سے وہ لائن کے قریب گر بیٹھا ہی تھا کہ انجن بڑی تیزی سے اس کے اوپر سے گزر گیا۔

پلیٹ فارم پر کھڑے سب لوگ خوف سے کانپ گئے۔ اکرام آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے دعا مانگ رہے تھے۔ اور سمیرا کی آنکھوں سے جانے کیوں دھارا دھار بارش کی طرح آنسو گرنے لگے۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آہنی ہتھوڑوں کی طرح برسنے لگے۔

یا الٰہی یہ کیسا انسان ہے۔ جوا بھی کھیلتا ہے، آوارہ گردی بھی کرتا ہے لیکن جب دوسروں کے کام آتا ہے تو اپنی قیمتی جان تک کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ اپنی جان سے بیزار ہے۔ نہیں۔ نہیں۔ اسے اپنے لئے نہیں تو اپنی ماں بہن کے لئے ضرور زندہ رہنا چاہیئے۔ سمیرا کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ مال گاڑی بھاری بھرکم آہنی پہیے ریلوے لائن کے بجائے اس کے دل پر سے گزر رہے ہیں۔ اور پھر اس کے منہ سے خود بخود نکلنے لگے۔ یا الٰہی اسے ہر ضرر سے بچانا۔ الٰہی.....

مال گاڑی سٹیشن پر رکے بغیر گزر گئی۔ پلیٹ فارم پر کھڑے سب لوگ بڑ
تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ لیکن سمیرا وہیں کھڑی رہی۔ اور کوئی بری خبر نہ
کے لئے اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھیں۔ ٹرین کا آخری ڈ
ہی شمیم بچے کو گود میں اٹھائے پلیٹ فارم پر چڑھا۔ سب لوگ گول دائر
کی شکل میں اس کے گرد جمع ہو گئے۔ جیسے وہ کوئی جواری نہیں۔ بہت
ہستی ہو۔ سمیرا نے دور ہی کھڑے جو شمیم کو بچے سمیت سلامت دیکھا تو ا
نے اپنے کانوں سے انگلیاں نکال لیں۔ اور اس کے سرخ یاقوتی ہونٹو
مستی میں ڈوبی ہوئی دلفریب مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

اکرام بھاگتے ہوئے آگے بڑھے اور شمیم کو گلے لگا کر بھینچ بھینچ کر پیار
ہوئے کہا۔

تم نے میرے بیٹے کو نئی زندگی دی ہے شمیم! تمہارا یہ احسان میں
نہ بھلا سکوں گا۔ تم جب پلیٹ فارم سے نیچے کودے تو انجن اس قدر جلد
اوپر سے گزرا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ تم زندہ نہ بچ سکو گے۔ لیکن حیرت ہے کہ
ساتھ بچے کو بھی بغیر کسی ضرر کے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئے ہو۔

شمیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

نیچے کودتے ہی میں بچے کو دبوچ کر پلیٹ فارم اور پٹڑی کے درمیا
جگہ پر فی الفور لیٹ گیا۔ جس کی وجہ سے گاڑی مجھے کوئی گزند نہ پہنچا سکی

کچھ دیر سکوت رہا۔ آخر شمیم پھر اکرام سے مخاطب ہوا۔

مجھے اجازت دیجئے۔ میں چلتا ہوں اب۔ آپ کسی کو لینے آئے ہیں کیا؟

ہاں چھوٹے بھائی راولپنڈی سے آ رہے ہیں۔ بس سبک رفتار آنے ہی
والی ہے۔ تھوڑی دیر رک جاؤ۔ پھر اکٹھے ہی چلتے ہیں۔

نہیں اب اجازت دیجئے مجھے ایک بیحد ضروری کام ہے۔

اکرام روکتے رہ گئے لیکن شمیم ان کے جواب کا انتظار کئے بغیر ارد گرد
ائرے کی شکل میں کھڑے مسافروں میں سے باہر آیا اور پلیٹ فارم کے گیٹ
لی طرف چل دیا۔ سیکنڈ کلاس کے ویٹنگ روم کے سامنے سے جب وہ
گزرنے لگا تو کسی نے نہایت دھیمی اور مترنم آواز میں اسے پکارا۔

سنئے!

شمیم رک گیا۔ اور جب اس نے بائیں طرف مڑتے ہوئے دیکھا تو سمیرا
اس کے بالکل قریب کھڑی بڑے شوق سے ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ
رہی تھی۔ شمیم چند سیکنڈ بڑی معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
اور پھر اپنے چہرے پر پرکشش مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

سمیرا تم! یہاں کیا کر رہی ہو؟

سمیرا نے چند قدم آگے بڑھ کر کہا

تھوڑی دیر رک کر ذرا میری بات سنئے۔

شمیم بھی دو قدم آگے بڑھا۔

کہئے۔؟

نہیں ۔ یہاں نہیں میرے ساتھ آیئے۔
شمیم نے بڑی حیرت سے پوچھا ۔
کہاں ؟
ڈیٹنگ روم میں چلئے ذرا
کوئی خاص بات ہے کیا ۔ ؟
ہاں ۔
دونوں سیکنڈ کلاس کے ڈیٹنگ روم کی طرف چل دیئے ۔ اندر داخل ہوتے ہی شمیم نے پھر پوچھا۔
کہئے کیا بات ہے ؟
سمیرا نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
پہلے بیٹھئے پھر بتاتی ہوں ۔
شمیم چپ چاپ بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہنے کے بعد نہ جانے اس نے کیا سوچا۔ اور سمیرا کے کسی سوال کا انتظار کئے بغیر شاید بات کا رخ بدلنے کی خاطر اسے مخاطب کرتے میں پہل کرتے ہوئے بولا ۔
تم یہاں سٹیشن پر کھڑی کیا کر رہی ہو ؟
سمیرا نے کسی خیال سے چونکتے ہوئے کہا۔
سکولوں میں چھٹیاں ہوگئی ہیں۔ میری دونوں بہنیں آج چھٹیاں گزارنے گھر آرہی ہیں۔ میں انہیں لینے کے لئے آئی ہوں۔

کون سی گاڑی سے آرہی ہیں ؟
تیز گام سے۔
ابھی گاڑی آنے میں کافی دیر ہے۔ تم ایک گھنٹہ پہلے ہی آگئی ہو۔
سمیرا نے اداسی کے عالم میں کچھ سوچتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔
ہاں ۔
دونوں کچھ دیر پھر خاموش رہے۔ آخر سمیرا بولی۔
آپ یہاں کیا کرنے آئے ہیں ۔
شمیم نے بغیر توقف کے کہا۔
بس یونہی ۔
چند ثانیئے تک شمیم کو عمیق نگاہوں سے دیکھنے کے بعد سمیرا نے بڑے اداس لہجے میں پوچھا ۔
بُرا نہ مانیئے تو میں آپ سے ایک ذاتی بات پوچھا چاہتی ہوں۔
شمیم نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔
پوچھئے ۔
آپ کی تعلیم کیا ہے۔
شمیم نے کمال سنجیدگی سے کہا۔
ان پڑھ۔
بالکل ؟

بالکل۔

سمیرا کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا۔ جیسے اسے اس جواب کی اُمید ہی نہ تھی۔ چند سیکنڈ کے بھیانک سکوت کے بعد سمیرا نے پھر سلسلہ کلام جاری رکھا

آپ پلیٹ فارم نمبر ۲ پر جھگڑا کیوں کر رہے تھے۔

بس ایسے ہی ایک معمولی سی بات پر ان سے جھگڑا ہو گیا۔

اور آپ ... سمیرا ایک دم رک گئی

شمیم نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

پوچھتے پوچھتے رک کیوں گئیں

آپ جوا کیوں کھیلتے ہیں؟

شمیم نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا۔

کس نے کہا تمہیں کہ میں جوجوا کھیلتا ہوں؟

میں نے خود دیکھا ہے۔

کب؟

تھوڑی دیر قبل۔ جب آپ جیت کر ٹرین کے خالی ڈبے سے باہر نکلے اور دوسرے جواری آپ سے جھگڑا کر رہے تھے۔ اگر یقین نہ ہو تو ایک اور ثبوت اس وقت آپ کے جیتے ہوئے بہت سے نوٹ بے کار کاغذوں کی طرح پلیٹ فارم پر بکھر گئے تھے۔

شمیم خجل سا گیا۔ جلد ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بڑے سنجیدہ

میں کہا۔

سمیرا! ہر انسان کے حالات ایک جیسے نہیں ہوتے۔ میں یہ کام مجبور ہو کر کرتا ہوں۔ اگر ایسا نہ کروں تو ماں بہن سمیت بھوکوں مر جاؤں۔

میں اس فلسفے کی قائل نہیں۔ زندہ رہنے کے لئے آپ کوئی اور کام بھی تو کر سکتے ہیں۔ جو سماج کی پُر تنقید نگاہوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔

شمیم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

مثلاً کون سا کام؟

کوئی سا بھی کر لیجئے۔ مگر ہو باعزت۔

تم ٹھیک کہتی ہو سمیرا۔ لیکن یہ زمانہ کج رو ہے۔ اس کا ساتھ دینے کے لئے اسی جیسی چال چلنا پڑتی ہے۔

بالکل غلط۔ میں نہیں مانتی۔ انسان کے ذہن میں اپنی کوئی منزل حیات ہونی چاہیئے۔ اور اس تک پہنچنے کے لئے اسے اوروں سے علیحدہ اور آسان راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔

مگر میری کوئی منزل نہیں۔ میری زندگی کا کل مقصد ماں اور بہن کا پیٹ پالنا ہے۔ اس کے لئے اگر مجھے کبھی کوئی غلط راستہ بھی اختیار کرنا پڑے تو میں شرمندگی محسوس نہیں کرتا۔

پھر آپ کے سوچنے کا انداز ہی غلط محور کے گرد گھومتا ہے۔

شمیم ایک دم کھڑا ہوا اور اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

چھوڑو سمیرا! تم بھی کون سی بحث لے بیٹھی ہو۔ میرا دامن اب نوکیلے خاردار وں میں بُری طرح الجھ چکا ہے اب اسے سمیٹ کر کسی دوسری منزل کو تلاش کرنا میرے بس کا روگ نہیں۔

سمیرا جواب میں کچھ کہہ بھی نہ پائی تھی کہ شمیم باہر جانے کے لئے دروازے کی طرف بڑھا۔ لیکن جونہی اس نے باہر نکلنے کی کوشش کی سمیرا پھر بولی۔

سنئے

شمیم رکا اور مڑ کر پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔

فرمائیے۔

سمیرا نے اداس اور ملتجی لہجے میں کہا۔

آپ میرے ساتھ وعدہ کیجئے آج کے بعد آپ جوا نہیں کھیلا کریں گے

شمیم نے ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

کیا تم چاہتی ہو اگر میں نے ایک سال زندہ رہنا ہے تو ایک دن رہوں

سمیرا کا چہرہ اس جواب پر فوراً پیلا پڑ گیا۔ اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے دنیا بھر کی مایوسیاں اور حسرتیں اس کے چہرے پر رقص کرنے لگی ہوں۔ جانے کیا سوچتے ہوئے نہایت مایوسی سے اس نے اپنا سر جھکا لیا۔

شمیم نے چند لمحے اسے پریشان مگر عمیق نگاہوں سے دیکھا۔ اس کے خوبصورت چہرے پر سنجیدگی کے گہرے اثرات تھے۔ پھر وہ واپس مڑا اور گردن جھکا کر جانے کن خیالات سے ٹکراتا ہوا ڈائننگ روم سے باہر نکلا لوگوں کی بھیڑ میں

سے آہستہ آہستہ گزرنے کے بعد پلیٹ فارم سے باہر آیا اور پھر شہر کی سڑکوں پر بھٹکتے لوگوں کے بے پناہ ہجوم میں روپوش ہو گیا۔

سمیرا ڈائننگ روم میں ہی بیٹھی رہی۔ وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ شمیم سے متعلق وہ جذبہ جسے اس نے محض ایک ہمدردی کا نام دے کر اپنے دل کے تاریک گوشوں میں دفن کر دیا تھا۔ اب محبت کا رنگین لبادہ اوڑھ کر اٹھا۔ اور راکھ کے نیچے دبی ہوئی ہمدردی کی وہ چنگاری محبت کا شعلہ بن کر بھڑک اٹھی۔ وہ بیتاب سی ہو گئی۔ اور سر جھکائے سوچنے لگی۔

الٰہی! محبت بھی ہوئی تو کس پتھر دل سے جسے نہ میرے جذبات کا احساس ہے اور نہ اپنی جان کی پرواہ۔ جوا وروں کے کام آ کر دوسروں کا جینا تو خوب جانتا ہے۔ لیکن اپنی زندگی سنوارنے کی خبر ہی نہیں خدایا تو نے مجھے امتحان میں ڈال دیا۔ میں تو شاید اتنا گہرا ساگر عبور کر کے کبھی بھی اپنی منزل تک نہ پہنچ سکوں گی۔

سمیرا اور زیادہ پریشان ہو گئی۔ لیکن ضمیر چیخ چیخ کر اُسے جھنجھوڑنے لگا۔

مایوس نہ ہو۔ تم اگر چاہو تو اسے سیدھی راہ پر لگا سکتی ہو۔ وہ طبعاً شریف آدمی ہے۔ تب ہی تو دوسروں کے کام آنے میں جان تک کی پرواہ نہیں کرتا لیکن چند مجبوریوں نے اسے غلط راہ پر ڈال دیا ہے۔ تم چاہو تو اب کچھ کر سکتی ہو۔ ہمت سے کام لو اور ایک پاکیزہ اور رنگین مشعل بن کر اس راہنمائی کرو۔ کیا تم پسند کرو گی تمہاری محبت کا مرکز اندھیروں میں بھٹک بھٹک کر ہمیشہ کے لئے

فنا ہو کر ختم ہو جائے گی۔

سمیرا نے سر کو ایک جھٹکا دیا۔ اور گردن اٹھا کر ایک عزم سے ساتھ بڑبڑائی

نہیں۔ نہیں۔ میں شمیم کو غلط راستوں پر بھٹکنے نہ دوں۔ وہ اب میری منزل ہے۔ اس کے بغیر میں اب ایک پل بھی زندہ نہ رہ سکوں گی۔ میں اس کی زندگی میں انقلاب برپا کر دوں گی۔ میں اسے بدل دوں گی۔ اب ... اب تو میں اور وہ ایک انوکھے اور رنگین رشتے کی ڈور میں بندھ چکے ہیں۔ میں ... میں اسے بدل کر رہوں گی۔ خواہ مجھے اپنی جان کی بازی ہی کیوں نہ لگانا پڑے۔

سمیرا اس سے آگے بھی شاید کچھ کہتی۔ لیکن باہر گاڑی کے آنے کا شور سنائی دیا۔ وہ فوراً سنبھل گئی۔ اور ویٹنگ روم سے نکل کر پلیٹ فارم پر آ گئی۔

۳

سمیرا ایک روز شام سے کچھ قبل شاپنگ کے لئے بازار جا رہی تھی کہ سرکلر روڈ کے بائیں جانب جب ایک شراب خانے کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ایک جگہ لوگوں کی بھیڑ کی طرف دیکھا تو خوف اور دہشت سے کانپ سی گئی۔ شمیم دو آدمیوں سے لڑ رہا تھا۔ دونوں اسے اندھا دھند گھونسے مار رہے تھے۔ لیکن جواب میں وہ بھی بُری طرح انہیں پیٹ رہا تھا۔ سمیرا فوراً آگے بڑھی روز بجلی کے ایک سب سٹیشن کے چھوٹے سے کمرے کی اوٹ میں ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔

اچانک اس کی ٹانگیں دہشت سے کانپنے لگیں۔ اور وہ گرتے گرتے سکل دیوار کا سہارا لے کر سنبھلی۔ شمیم اب اس کی طرف منہ کئے ہوئے تھا۔ اس

کی خوب صورت پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ اردگرد کافی آدمی کھڑے ہ
لیکن کسی نے بھی انہیں لڑائی سے باز رکھنے کی کوشش نہ کی بلکہ ایک م
اور لمبا سا آدمی جو شراب کے نشے میں چور دکھائی دیتا تھا شمیم کو لمبی لمبی ا
غلیظ گالیاں دے رہا تھا۔ شمیم کی یہ حالت دیکھ کر سمیرا کی آنکھوں سے آنسو
کے سوتے پھوٹ نکلے اور وہ اپنے دوپٹے کے پلو میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ
کر رونے لگی۔

باہر کھڑا موٹا آدمی جب بھی شمیم کو گالیاں دیتا وہ بڑی غصیلی نگاہ
اس کی طرف دیکھتا۔ لیکن دو آدمیوں کے ساتھ لڑنے میں وہ کچھ ایسا مصر
تھا کہ اس کی طرف بڑھنے کا موقع ہی نہ ملتا۔ ایک دفعہ شمیم اپنے سے لڑ
والے دونوں آدمیوں کو بُری طرح لگاتار گھونسے رسید کرتا ہوا کافی دور تک
بڑھا اور پھر اس قدر پھرتی سے اس موٹے آدمی کی طرف بڑھا جیسے کوئی چ
چیتا اپنے شکار پر حملہ آور ہوتا ہے۔ موٹے آدمی کے قریب پہنچتے ہی شمیم
اس کے پیٹ اور منہ پر کچھ اس قدر سخت اور زوردار گھونسے رسید کیے کہ اس
سے خون بہنے لگا اور وہ زمین پر بیٹھ کر چیخنے چلانے لگا۔

شمیم اب دونوں کو پیٹا ہوا بار بار پیچھے دھکیل کرے جاتا۔ وہ دونوں فرا
کی راہ تلاش کر رہے تھے۔ پھر جب شمیم نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ان پ
بائیں سے گھونسوں کی بارش شروع کر دی تو وہ ایک دوسرے کو اشارہ کر
ہوئے بھاگ گئے۔

شمیم ایک جگہ کھڑے ہو کر اپنی پیشانی سے خون صاف کرتا رہا پھر ایک طرف
بڑھنے لگا۔ سمیرا نے آگے بڑھ کر شمیم کا راستہ روکنے کا ارادہ کیا۔ لیکن اتنے لوگوں
کی موجودگی میں وہ ایسا نہ کر سکی۔ اور شمیم ایک گلی میں گھس کر نگاہوں سے اوجھل
ہو گیا۔ سمیرا مجبوراً شاپنگ کے لیے بازار چلی گئی۔

دوسرے روز اس نے شمیم کے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن خوف اور شرم کے
باعث وہ ایسا بھی نہ کر سکی سہ پہر کے تھوڑی دیر بعد وہ اپنی چچازاد بہن تحمینہ کو
ساتھ لے کر لیڈی ڈاکٹر مس عصمت کے کلینک چلی گئی۔ مس عصمت مریضوں کے
معائنے میں مصروف تھی لہٰذا وہ انتظار کے کمرے میں بیٹھ گئی۔

ویٹنگ روم میں بیٹھے سمیرا کو تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ شمیم کلینک میں داخل
ہوا اس کی پیشانی پر سفید پٹی بندھی ہوئی تھی کہ سمیرا اٹھ کھڑی ہوئی اس نے سوچا
شمیم شاید مردانہ انتظار گاہ کی طرف جائے گا۔ اس لئے وہ وہاں جا کر اسے
مل لے گی۔ لیکن انتظار گاہ کی طرف جانے کے بجائے شمیم سیدھا کلینک میں
گھس گیا۔ مس عصمت اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور مسکرا کر
بڑے پیار سے انداز میں شمیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

آؤ شمیم!

شمیم بے دھڑک آگے بڑھا اور اس کے پہلو میں پڑی ہوئی خالی کرسی پر
بیٹھ گیا۔ سمیرا حیران رہ گئی کہ عصمت شمیم کو اس قدر وقعت کیسے دے رہی
ہے۔ اور شمیم اس سے اس قدر فری کیوں کر ہے۔ عصمت نے اپنے سامنے

بیٹھی ہوئی ایک مریضہ کو جلدی جلدی فارغ کر دیا اور پھر اپنا رُخ شمیم کی طرف کر کے بیٹھ گئی۔ جونہی اس کی نظر شمیم کی پیشانی پر پڑی وہ ایک دم مغموم سی ہو گئی اور بڑی بے تابی سے پوچھا۔

یہ تمہاری پیشانی پر کیا ہوا شمیم؟

شمیم ٹال گیا۔

کچھ نہیں۔ بس یونہی معمولی سی چوٹ آگئی۔

سمیرا کلینک میں کھلنے والے دروازے کے پردے کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گئی اور ان کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی رازداری سے دونوں کی باتیں سننے لگی۔

عصمت اپنی جگہ اٹھتی ہوئی بولی۔

کھولو پٹی۔ مجھے زخم دکھاؤ۔ میں دھو کر نئی پٹی باندھ دیتی ہوں۔

شمیم نے پھر ٹالنے کی کوشش کی۔

نہیں نہیں تم بیٹھو۔ پہلے میری بات سنو۔

عصمت بھی ضد پر اتر آئی۔

نہیں۔ باتیں بعد میں ہوں گی پہلے مجھے زخم دیکھنے دو۔

شمیم مجبور ہو گیا۔ عصمت نے خود آگے بڑھ کر پٹی کھولی اور زخم اچھی طرح دھو لے کے بعد نئی پٹی باندھنے لگی۔ سمیرا بڑی حیرت سے دونوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی کہ عصمت اور شمیم میں یہ التفات کیسا؟

شمیم کے پٹی باندھ چکنے کے بعد عصمت پھر اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ کچھ دیر خاموش رہی آخر بڑے مغموم لہجے میں شمیم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

شمیم! میں پہلے بھی کئی بار کہہ چکی ہوں کہ جوا کھیلنا چھوڑ دو لیکن تم ہو کہ دوسروں کی نصیحت کو فضولیات سمجھتے ہوئے کسی بات کا اثر ہی نہیں لیتے

شمیم نے قدرے مسکرا کر کہا۔

تمہیں تو ہر وقت مجھ پر نکتہ چینی کی رہتی ہے۔ تم نے کیسے جانا کہ میں نے جوا کھیلنا بند نہیں کیا۔

عصمت نے کرب انگیز لہجے میں کہا۔

مجھے بیوقوف نہ بناؤ! تمہاری پیشانی کا زخم بتا رہا ہے کہ جوا کھیلتے ہوئے تمہارا کسی سے جھگڑا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اور کسی وجہ سے تمہاری پیشانی پر اس طرح کا زخم نہیں آسکتا۔؟

شمیم نے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔

جیسے تم سمجھ لو۔

عصمت پھر بولی۔

شمیم! مجھے تم سے ایک اور شکایت بھی ہے۔

کون سی؟ شمیم نے اس طرح نگاہیں جھکائے ہوئے پوچھا۔

تم نے اب گھر پر ٹھہرنا بھی کم کر دیا ہے۔

بدھ کس نے کہا تھا؟

میں آج خود تمہارے ہاں گئی تھی۔ امی کی کھانس کھانس کر بُری حالت ہو
رہی تھی اور تمہاری بہن ثمینہ ان کے پاس بیٹھی رو رہی تھی۔ لیکن تم گھر سے
غائب تھے۔ میں نے احوال پرسی کے بعد جب تمہارے متعلق پوچھا تو پھوٹ
پھوٹ کر رونے لگیں اور سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

عصمت بیٹی! دیکھ رہی ہو اس کی حالت اس کے ابا کے بعد میں نے
اسے کس شوق اور محنت سے پڑھانا شروع کیا تھا اور جب ایم بی بی ایس کرنے
میں اس کے صرف دو سال رہ گئے تھے تو مجھے ٹی بی ہو جانے کی وجہ سے اس
نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ کاش! وہ اپنی پڑھائی جاری رکھتا۔ تو میں کسی نہ کسی طرح اس
کا خرچ پورا ہی کرتی رہتی لیکن اس نے میری ایک نہ مانی اور کالج چھوڑ دیا۔ بیٹی!
آج اگر وہ ایم بی بی ایس ہوتا تو کسی ہسپتال کا کامیاب ڈاکٹر یا اپنے کسی کلینک
کا مالک ہوتا۔ اور مجھے آج محلے والوں کا یہ طعنہ نہ سننا پڑتا کہ تمہارا جواری ہے
اب دیکھ رہی ہو اس کی حالت سارا سارا دن مجھے کچھ بتائے بغیر گھر سے غائب
رہتا ہے۔ یہ اس کی بہن بیٹھی ہے۔ سارا سارا دن اس کی یاد میں روتی رہتی ہے۔
لیکن وہ صبح گھر سے نکلتا ہے اور شام کو سامان سے لدا پھندا گھر لوٹ
آتا ہے۔

شمیم کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے تھے اس نے فوراً عصمت کی بات
کاٹتے ہوئے ڈوبتی ہوئی آواز میں بڑی بے تابی سے کہا۔

بس کرو عصمت خدا کے لئے بس کرو۔ میں اس سے آگے نہیں سن سکتی ہے اور سب سے بڑھ کر گھر کے اخراجات کہاں سے پورے ہوتے اور

عصمت نے روتے ہوئے کہا۔

شمیم تمہاری امی اور بھی بہت کچھ کہتیں۔ لیکن کھانسی کا ختم نہ ہونے والا
دورہ پڑا اور وہ کچھ نہ کہہ سکیں۔

شمیم نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

لیکن ثمینہ نے میرے سامنے ذکر تو نہیں کیا کہ امی کو آج کھانسی کا دورہ پڑا

وہ کہتی بھی کیسے اسے آپ سے بے پناہ محبت ہے وہ بے شک کم عمری
لیکن اپنے بھائی کو ایسی بات بتا کر وہ اسے پریشان اور اداس کیوں کر
سکتی تھی۔

پردے کے پیچھے بیٹھی ہوئی سمیرا عصمت کی باتیں سن کر پھوٹ پھوٹ
رونے لگی۔ لیکن جب اس نے یہ سنا کہ شمیم نے ایم بی بی ایس سے چھوڑ
دیا ہے تو اس کے ہونٹوں پر آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تو بہ شکن مسکراہٹ نمودار
ہوئی اور اس نے ہلکے سے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

شریر کہیں کے۔ مجھے کہتے تھے میں بالکل ان پڑھ ہوں۔

شمیم کی آواز بھرّا گئی۔

عصمت! تم خود ہی سوچو میں پڑھائی کیسے جاری رکھتا۔ امی کو جب ٹی بی
کوئی انہیں سنبھالنے والا نہ تھا۔ ثمینہ چھوٹی تھی دوسرے وہ سکول

ماں کی بیماری کے لئے روپیہ کہاں سے آتا عصمت میں شاید جوا کھیلنا بھی شر
نہ کرتا۔ لیکن میں نے کالج چھوڑ کر سروس کے لئے دن رات انتھک کوشش
لیکن ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ تنگ آکر میں نے وہی لائن اختیار کی
پر آج کل میں چل رہا ہوں۔

عصمت نے رومال سے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔

شمیم! کاش تم کسی نہ کسی طرح ایم بی بی ایس کر لیتے تو تمہاری دنیا آج
دنیا سے مختلف ہوتی۔

شمیم نے بڑے مایوسانہ انداز میں کہا۔

عصمت! میرے بس کی کوئی بات نہیں۔ خدا کو ہی کچھ ایسا منظور تھا۔

ماحول پر کئی سیکنڈ تک مغموم اور بھیانک خاموشی چھائی رہی۔ آخر عصمت
کچھ سوچتے ہوئے مسکراتی اور پھر شمیم کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے شفیقانہ
میں کہا۔

شمیم ایک بات کہوں۔

ہاں کہو!

تم پھر کالج میں داخلہ لے لو۔ تمہارے تمام اخراجات میں برداشت کروں گی

شمیم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

نہیں عصمت ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں اسے معیوب سمجھتا ہوں۔ میں جس ڈگر
پر جا رہا ہوں مجھے اسی پر چلنے دو۔ ہو سکتا ہے کبھی بھولی بھٹکی منزل خود میرے

راستے کی رکاوٹ بن کر میری زندگی کے اس دھارے کا رخ موڑ دے۔

اچھا میں غیب کی کون سی بات ہے شمیم! اگر تم اسے معیوب سمجھتے ہو تو
پڑھائی کے بعد جب تم کمانے لگو تو سارا حساب بیباق کر دینا۔

شمیم نے بیزاری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

عصمت چھوڑو ان باتوں کو۔ کوئی اور موضوع چھیڑو۔

عصمت خاموش ہو گئی شمیم نے چپ چاپ اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ
ڈالا اور بے ترتیبی سے بھونسے ہوئے دس دس کے کئی نوٹ نکال کر عصمت
کے سامنے میز پر ڈھیر کر دیئے۔

عصمت نے بڑی حیرانگی سے پوچھا

یہ کیا شمیم؟

تمہاری فیس اور دواؤں کا خرچ۔

کون سی دوائیں؟

امی کے علاج کی۔

لیکن میں تو ان کی کوئی قیمت نہ لوں گی۔

کیوں؟

وہ جس طرح آپ کی امی ہیں ایسے ہی میں بھی انہیں سمجھتی ہوں۔
یہ تو تمہاری بلند کرداری ہے۔ بہر حال یہ روپے تمہیں لینا ہوں گے۔
لیکن میں تو کسی صورت میں لینے کے لئے تیار نہیں۔

شمیم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا

ضد نہ کرو عصمت۔

عصمت بھی میز سے نوٹ سمیٹتی ہوتے اٹھی اور بڑی بیتابی سے پوچھا۔

کہاں چلے ہو؟

میں اب چلتا ہوں کافی دیر ہوگئی ہے۔ اور پھر تمہارے کئی مریض تو انتظار کر رہے ہوں گے۔

عصمت نے کچھ کہے بغیر سارے نوٹ شمیم کی جیب میں ٹھونس دیئے۔

شمیم نے خفگی سے پوچھا۔

یہ کیا؟

کہہ جو دیا ہے میں نہیں لوں گی۔

اس کا مطلب ہے آئندہ میں تمہارے پاس نہ آیا کروں۔

عصمت نے چونک کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

شمیم پھر ایسی بات نہ کہنا۔

اگر یہ بات ہے تو پھر لے لو روپے۔

نہیں فی الحال تم اپنے پاس رکھو۔ میں قسمیہ کہتی ہوں جب مجھے ضرورت ہوگی تم سے مانگ لوں گی۔

لیکن ہوسکتا ہے اس وقت میرے پاس ایک پائی بھی نہ ہو۔

میں وعدہ کرتی ہوں۔ میں مجبور نہیں کروں گی۔ تمہارے پاس ہوں تو دے

نہیں تو ...

شمیم نے فوراً اس کی بات کاٹ کر جیب سے پھر نوٹ نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

نہیں عصمت! تم ابھی لے لو۔ بیباق حساب اچھا ہوتا ہے۔

عصمت نے زبردستی اس کی جیب سے ہاتھ نکالتے ہوئے کہا۔

ضد نہ کرو شمیم۔

شمیم نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اچھا میں چلتا ہوں۔

کہاں جاؤ گے ابھی؟

گھر اور کہاں۔

میری کار لیتے جاؤ پھر۔

تم کیسے جاؤ گی گھر۔

"تو کیا شمیم اور عصمت ایک دوسرے کو چاہتے ہیں"

لیکن وہ سر کو جھٹک کر خود ہی اپنے آپ کو تسلی دینے لگی۔

میں پیدل چلی جاؤں گی۔

نہیں عصمت میں پیدل چلنے کا عادی ہوں۔ ویسے تمہاری مہربانی۔

پردے کے پیچھے بیٹھی ہوئی سمیرا کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اور یہ الفاظ بار بار اس کے ذہن پر ہتھوڑوں کی طرح برسنے لگے۔

نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ شمیم اب میری منزل ہے۔ میں اس کے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گی۔ وہ میرے ہیں۔ میں ۔۔۔ میں انہیں حاصل کر کے رہوں گی چاہے اس کے لئے مجھے عصمت سے بھیک ہی کیوں نہ مانگنا پڑے۔

سمیرا شاید اس سے آگے بھی کچھ سوچتی لیکن شمیم کلینک سے باہر جا رہا تھا۔ لہٰذا وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ کلینک کے بیرونی گیٹ کے قریب پہنچ شمیم پھر رکا اور عصمت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

عصمت! میں کل اسی وقت ثمینہ کو ساتھ لے کر آؤں گا۔ تاکہ وہ ایک دفعہ تمہارا کلینک دیکھ لے۔ میں ہو سکتا ہے کبھی گھر نہ ہوں اور امی کے لئے تمہاری ضرورت پڑ جائے۔ اس صورت میں وہ خود ہی تمہیں بلا کر لے جایا کرے گی۔

عصمت نے اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

ٹھیک ہے میں کل اس وقت کہیں نہ جاؤں گی۔

شمیم جونہی کلینک سے باہر نکلا سمیرا پردے کے پیچھے سے اٹھی اور انتظار گاہ کے ایک کونے میں صوفے پر بیٹھی ہوئی اپنی چچازاد بہن ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

بالو! تم تھوڑی دیر یہیں بیٹھو۔ میں اپنی ایک سہیلی کے ہاں سے ہو کر پھر واپس آ کر تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گی۔

صوفے پر بیٹھ کر اونگھتی ہوئی ثمینہ نے اثبات میں سر ہلا دیا اور سمیرا بجلی کی سی تیزی سے باہر نکل گئی۔

۴

عصمت کے کلینک سے نکل کر شمیم بازار میں ہوتا گھر جا رہا تھا کہ کسی نے ہلکے سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

سنئے۔

شمیم نے رک کر جو دائیں طرف دیکھا تو سمیرا اس کے قریب کھڑی تھی۔ شمیم نے بڑی حیرانگی سے کہا۔

سمیرا تم! کیا بات ہے؟

سمیرا نے شرماتے ہوئے کہا۔

مجھے آپ سے ایک کام ہے۔ ذرا میری بات سنئے۔

کہو! میں نے ذرا جلدی گھر جانا ہے۔

نہیں یہاں نہیں۔ میرے ساتھ آئیے۔

کہاں؟ شمیم نے پریشانی سے پوچھا۔

آپ پریشان کیوں ہو گئے ہیں۔ میرے ساتھ تو آئیے۔

شمیم چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا۔

سمیرا اس کو ساتھ لے کر ایک صاف ستھرے کیفے میں داخل ہوئی اور باکس میں اس کے ساتھ علیحدگی میں بیٹھتے ہوئے چائے کا آرڈر دے ڈالا۔

دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ اتنی دیر میں بیرا چائے کی ٹرے رکھ گیا۔ سمیرا پیالے بنانے لگی۔ اور شمیم ٹکٹکی باندھ کر اس کے خوب صورت بھرے بھرے اور چکنے ہاتھوں کی طرف دیکھنے لگا۔ سمیرا نے چائے کی جھلکتی ہوئی پیالی جب شمیم کی طرف بڑھائی تو وہ گرم گرم اور خوش ذائقہ گھونٹ حلق سے نیچے اتارتا ہوا بولا۔

کیا بات ہے سمیرا! کیا کہنا چاہتی ہو؟

سمیرا نے چائے کی پیالی اپنے نازک اور سرخ لبوں سے جدا کرتے ہوئے کہا۔

آپ نے میرے سامنے جھوٹ کیوں بولا تھا کہ آپ اَن پڑھ ہیں۔

شمیم نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

کس نے تمہیں کہا کہ میں اَن پڑھ نہیں؟

مَیں مس عصمت کے کلینک میں آپ اس کے درمیان پوری گفتگو سن چکی ہوں۔

شمیم نے حیرت سے پوچھا۔

تم کہاں تھیں کلینک میں؟

زنانہ انتظار گاہ میں۔

کیوں۔

چچازاد بہن تحمینہ کی ٹانگوں پر پھوڑے نکل آئے ہیں اسے مس عصمت کو دکھانے آئی تھی۔

تو اُس کو کہاں چھوڑ آئی ہو۔؟

وہیں کلینک میں بیٹھی ہے۔ میں اسے اپنی ایک سہیلی سے ملنے کا کہہ کر آئی ہوں۔ وہ بے چاری میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ میں آپ سے صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ..... سمیرا فوراً رک گئی۔

شمیم نے چہرہ گھما کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کہو کہو! تم رک کیوں گئیں۔

سمیرا نے رک رک کر کہا۔

آپ ..... آپ کالج میں داخلہ لیکر پھر اپنی پڑھائی شروع کر دیجئے۔

بھوکوں مرنے کے لئے۔ شمیم کے لہجے میں طنز تھا۔

کیوں؟ آپ کے سارے اخراجات میرے ذمہ ہوں گے۔

لیکن مجھے منظور نہیں۔

کیوں؟

مجھ میں کسی کا بار احسان برداشت کرنے کی ہمت نہیں۔

میں آپ کو بوجھ محسوس ہونے ہی نہ دوں گی۔

لیکن مجھے پھر بھی منظور نہیں۔ میری زندگی کے اب صرف دو ہی مقصد ہیں۔ بیماں کا علاج اور بہن کی پڑھائی۔

میں مس عصمت کی زبانی سن چکی ہوں آپ کی امی کو ٹی بی ہے۔ مجھے بے حد افسوس ہے۔

شمیم خاموش رہا۔ سمیرا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

اگر آپ پڑھنا نہیں چاہتے۔ تو پھر ایک اور کام کیجئے۔

وہ کیا؟

پہلے وعدہ کیجئے کہ آپ انکار نہیں کریں گے۔

نہیں تم پہلے کہو تو۔

سمیرا کچھ رکی۔ پھر جھجکتے ہوئے کہا۔

آپ جوا کھیلنا چھوڑ دیجئے۔ دیکھئے ٹالئے گا نہیں۔ اس دفعہ آپ کو پکا وعدہ کرنا ہوگا۔

سمیرا میں وعدہ نہیں کرتا۔ کوشش ضرور کروں گا۔ اگر میں کسی اور طریقے سے اپنی شوریدہ حالی سے نپٹنے میں کامیاب ہوگیا تو یہ دھندا ضرور چھوڑ دونگا کوشش نہیں وعدہ کیجئے۔ آپ کسی اچھی سی سروس تلاش کیجئے۔ میں ابا جان سے کہہ کر آپ کے لئے کسی اچھی سروس کی کوشش کروں گی۔

کہہ تو دیا ہے سمیرا! کوشش کروں گا اگر میں فی الفور یہ دھندا چھوڑ دوں تو ار
سنگ دل جہاں میں بھوک سے سسک سسک کر مر جاؤں۔ آخر پیٹ پالنے کے
لئے میرے پاس کوئی حیلہ تو ہونا چاہیئے۔

سمیرا نے پُرسوز لہجے میں کہا۔

یوں نہ کہیے پیٹ پالنے کا کیا ہے۔ وہ تو ایک بھکاری بھی دن بھر در بدر
کی ٹھوکریں کھا کر بھیک مانگنے کے بعد اپنا پیٹ پال لیتا ہے۔ اور پھر آپ
تو تعلیم یافتہ ہیں۔ کیا آپ جوا کو اچھا سمجھتے ہیں۔ اور کیا آپ جیسے بلند کردار
اور اعلیٰ شخصیت کے مالک کو یہ کام زیب دیتا ہے؟

سمیرا کے یہ الفاظ سن کر شمیم چونک سا پڑا۔ اس کے چہرے پر تفکرات
اور غم کی گہری پرچھائیاں چھا گئیں۔ جواب میں کچھ کہنے کے بجائے سر جھکا کر
کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ سمیرا نے سوچا شمیم اس کی بات کا شاید برا مان گیا
ہے۔ لہٰذا فوراً موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

آپ مس عصمت کو کب سے جانتے ہیں۔

شمیم نے چونک کر سر اوپر اٹھایا۔

وہ ایم بی بی ایس میں میری کلاس فیلو تھی۔ دوسرے امی کا علاج بھی وہی
کر رہی ہے۔

سمیرا خاموش ہو گئی۔ لیکن شمیم نے پُرشوق نگاہوں سے اس کی طرف
دیکھتے ہوئے کہا۔

سمیرا! یہ نہ سوچنا میں تمہارے جذبات سے باخبر نہیں۔ میں صرف اپنی
مجبوری کے سبب بے تاب دل کی دھڑکن کا اظہار نہیں کرنا چاہتا۔

سمیرا نے لجاتے ہوئے کہا۔

اس سے کیا ہوتا ہے۔ پانچوں انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں لیکن کام
ایک ہی جیسا کرتی ہیں۔

شمیم نے کمال سنجیدگی سے کہا۔

اگر یہ بات ہے تو سنو۔ مجھے تم سے ایسی محبت ہے جسے میں مرتے دم تک
فراموش نہیں کر سکوں گا۔

سمیرا کا خوب صورت چہرہ سُرخ ہو گیا اور شرماتے ہوئے سر جھکا لیا۔
شمیم اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے پہلو میں ایک خالی کرسی پر جا بیٹھا
پھر اُس نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ اور بڑے پیارے انداز میں اس
حسین چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے شرارت آمیز تبسم سے پوچھا۔

کیا بات ہے سمیرا برا مان گئیں کیا۔

سمیرا نے اپنا چہرہ آہستہ آہستہ اوپر اٹھایا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تیر
رہے تھے۔ شمیم نے اس کے سرخ سرخ عارض اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے
ہوئے اس کا چہرہ تھام لیا۔ سمیرا کے گرم گرم آنسو نکلے اور بھیگے بھیگے سفید عارض
پر پھسلتے ہوئے شمیم کے ہاتھوں پر گر گئے۔

شمیم بے تاب ہو کر پوچھا۔

سمیرا یہ آنسو کیسے ؟

سمیرا نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

آپ نے یہ الفاظ کیوں کہے۔ میں بھلا اس بات کا برا مان سکتی ہوں
کے منہ سے یہ الفاظ سننے کے لئے تو میں عرصہ سے بے تاب تھی۔ آپ کی
میرے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی ہے میں تو آپ کی جدائی میں ایک
پل کانٹوں کی سیج پر گزارتی ہوں۔

شمیم نے متبسم نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا بازو اس کی
اور لچکیلی کمر کے گرد لپیٹ دیا۔ سمیرا کا مرمریں جسم کانپنے لگا۔ پھر بدن نے
جھرجھری لی اور وہ بڑی بے قراری سے پہلو بدلنے لگی۔ لیکن جب شمیم
اس کی کمر کے گرد اپنے بازو کا حلقہ تنگ کیا تو سمیرا کا بھرا بھرا جسم شمیم کی
میں سمٹ آیا۔

اور

اور دونوں شباب کی رنگینی میں ڈوبے ہوئے جسم ایک دوسرے
محبت کا افسانہ سنانے لگے۔ سمیرا شمیم کی چھاتی پر سر رکھے اس کی گود میں پڑی
اس کی شیشے کی طرح چمکتی ہوئی خوب صورت چھاتی کے رنگین دل کش اور
شکن ابھار شمیم کی مضبوط چھاتی سے ٹکراتے رہے ماحول پر خمار اور مدہوشی
سی کیفیت طاری کرنے لگے۔ تھوڑی دیر ایسا ہی عالم رہا اور دونوں ایک
دوسرے کے بے قرار دل کی دھڑکن سنتے رہے۔

آخر سمیرا نے شمیم کی گود میں سمٹے ہی سمٹے دیدۂ محبت سے اس کی طرف دیکھتے
ہوئے کہا۔

چلئے اٹھئے چلیں۔ آپ گھر جائیں میں بھی واپس جاتی ہوں تھینہ میرا انتظار کر
ہی ہوگی۔

دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ شمیم نے بل ادا کیا کیفے سے باہر آکر وہ گھر چلا گیا۔
سمیرا عصمت کے کلینک کی طرف چلی گئی۔

دوسرے روز سہ پہر کے بعد سمیرا، تھینہ کے ساتھ جب عصمت کے کلینک
داخل ہوئی تو عصمت اور شمیم آپس میں باتیں کر رہے تھے اور قریب ہی
یم کی بہن ثمینہ بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ سمیرا جھجک گئی۔ اندر داخل ہونے کے
ئے اس نے انتظار گاہ کا رخ کیا تھا کہ شمیم کی آواز اس کے کانوں سے

آجاؤ سمیرا۔

سمیرا، تھینہ کے ساتھ اندر داخل ہوئی جب وہ ان سے ذرا قریب ہوئی
شمیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

آؤ سمیرا، ہم تمہاری ہی باتیں کر رہے تھے۔

اور پھر وہ عصمت سے مخاطب ہوا۔

عصمت! یہ ہیں سمیرا۔ جن کا میں ذکر کر رہا تھا۔

عصمت اپنی جگہ سے اٹھی، اور سمیرا کو پکڑ کر اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ اس

سے کچھ کہنے کے لئے ابھی وہ منہ سے بولنے بھی نہ پائی تھی کہ ثمینہ اور ثمیر
میں لپٹ گئیں۔

سب حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ آخر شمیم بولا۔

ارے ثمینہ! تم کب سے جانتی ہو ثمینہ کو۔

ثمینہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

یہ میری کلاس فیلو ہے بھائی جان۔

سچ؟

اس سے پوچھ لیجئے بے شک۔

کیوں ثمینہ؟

جی ہاں۔

شمیم کے خاموش ہو جانے پر ثمینہ نے بڑی رازداری سے شمیم کی طرف
کر کے ثمینہ کے کان سے منہ لگا کر دھیمی سی آواز میں پوچھا۔

ثمینہ یہ کون ہیں؟

میرے بھائی۔

سچ؟

پوچھ لو ان سے۔

کیا نام ہے ان کا؟

شمیم!

تم ابھی میرے ساتھ ہمارے گھر چلو گی نا۔

بھائی جان سے پوچھ لو پھر چلو گی۔

ثمینہ شمیم کی طرف متوجہ ہوئی۔

شمیم بھائی، ثمینہ کو جانے دیجئے نا آج ہمارے ہاں۔

نہیں ثمینہ! ابھی ہمیں گھر ایک ضروری کام ہے پھر کسی دن آئے گی ثمینہ۔

ثمینہ نے مچلتے ہوئے کہا۔

پھر آپ بھی آئیے گا۔

اچھا میں بھی آؤں گا

کب تک آئیں گے۔

جب بھی فرصت ہوئی آؤں گا۔

ثمینہ کے خاموش ہونے پر شمیم اٹھ کھڑا ہوا۔ اور عصمت کی طرف دیکھتے
ئے کہا۔

اچھا عصمت! میں چلتا ہوں۔

عصمت نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

امی کے لئے جب کبھی میری ضرورت ہو ثمینہ سے کہہ کر مجھے بلا لیا
ں۔

شمیم نے پیار سے ثمینہ کا کان پکڑتے ہوئے کہا۔

سن لیا...؟

ثمینہ، عصمت کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔
آپی! آپ فکر نہ کیجئے۔ میں خود آپ کو بلا لیا کروں گی۔
شمیم اور ثمینہ کلینک سے باہر نکل گئے۔ اور عصمت تحمینہ کی باتوں کے پھوڑے دیکھنے لگی۔

وقت شب و روز کے رہوار پر سوار بڑی تیزی سے اپنی منزل کیطرف بڑھتا رہا۔ گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہوگئیں۔ سمیرا کی بڑی بہنیں رشیدہ اور النساء چھٹیاں ختم کر کے سندھ چلی گئیں۔ ان سے چھوٹا بھائی سہیل اب تھرڈ ائیر میں تھا۔ اور وہ خود سیکنڈ ائیر کی طالبہ تھی۔ عصمت کے کلینک میں ملاقات کے بعد شمیم پوری چھٹیاں اسے کہیں دکھائی نہ دیا۔ دو تین بار اُس نے شمیم کے ہاں جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن ایک حجاب سا تھا جس نے اسے وہاں جانے سے روکے رکھا۔

ایک روز وہ کالج سے نکل کر بازار میں تھوڑی سی شاپنگ کرنے کے بعد گھر واپس لوٹ رہی تھی کہ سڑک کی دوسری جانب اُسے شمیم دکھائی دیا وہ

عابد الیکٹرک فین کمپنی کے بڑے گیٹ سے نکلا اور دروازے کے قریب ہی نل پر ہاتھ منہ دھونے لگا۔ سمیرا نے فوراً سڑک پار کی شمیم کے پاس تھوڑی دیر کھڑی رک گئی۔ ہو کر مسکراتی رہی۔ پھر پہلی بار اُسے اس کے نام سے مخاطب کرتی ہوئی بولی۔

شمیم!

شمیم چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

سمیرا پھر بولی۔

کیا کر رہے ہو یہاں؟

شمیم منہ پونچھتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔

کچھ بھی نہیں۔

کہاں رہے اتنے دن ملے کیوں نہیں؟

یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ پھر کبھی سناؤں گا۔

تو یہاں کیسے آئے ہو؟

شمیم سنجیدہ ہو گیا۔

سمیرا! میں نے جوا کھیلنا چھوڑ دیا ہے۔ اب میں فیکٹری میں کام کرتا ہوں۔

سچ؟

تم نے خود ہی تو کہا تھا جوا کھیلنا بند کر دو۔

سمیرا اس انکشاف پر وفورِ نشاط میں آپے سے باہر ہو گئی۔

تم نے بہت اچھا کیا شمیم۔ میں ..... میں اب .... وہ کچھ کہتے کہتے

شمیم پھر بولا۔

میرے ساتھ چلو گی نا؟

کہاں؟

ہمارے گھر! امی تمہیں بہت یاد کرتی ہیں۔ میں ایک دفعہ تمہیں بلانے ارے محلے بھی گیا تھا۔ لیکن کچھ شرم اور اجنبیت کے باعث تمہیں بلائے یر واپس لوٹ آیا۔

انہیں میرے متعلق کیسے پتہ چلا۔

میں نے جب جوا چھوڑ کر فیکٹری میں کام کرنا شروع کیا تو بڑی حیران ئیں۔ اور اس اچانک تبدیلی کے محرک کے بارے میں پوچھا تو میں نے ارا نام بتا دیا۔ اور پھر تمہارے ساتھ پہلی ملاقات بھی تفصیل سے سنا ڈالی۔ اس روز سے وہ تمہیں ملنے کے لئے ہر وقت بے چین رہتی ہیں۔

سمیرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پہلے آپ اپنا وعدہ تو پورا کیجئے۔

کون سا وعدہ؟

آپ نے تحمینہ سے کہا تھا نا کہ آپ خمینہ کو ساتھ لے کر ان کے ہاں ائیں گے۔ وہ ہر روز آپ کا انتظار کرتی ہے اور اب تو اس نے یہاں تک

فند کرنا شروع کر دی ہے کہ اس کی امّی بھی مجھے کئی بار اسے اپنے ہاں
جانے کے لئے کہہ چکی ہیں۔ اور ہاں میں نے آپ کے لئے ایک کام کی
کر رکھا ہے۔

کیسا کام ؟

پہلے چلئے گھر۔ پھر آرام سے بیٹھ کر بتاؤں گی۔

ہمارے ہاں چلو گی نا ؟

ہاں۔ چلئے۔

نہیں۔ تم آگے آگے چلو۔ میرے کپڑے میلے ہیں۔ میں تمہارے
چلتا اچھا نہیں لگتا۔ شمیم نے شرارتاً کہا۔

سمیرا فوراً سنجیدہ ہو گئی

آپ آئندہ ایسے الفاظ نہ کہئے ورنہ .....

شمیم نے بڑے شوخ تبسم سے پوچھا۔

ورنہ کیا ؟

ورنہ ..... ورنہ ..... بس کچھ بھی نہیں۔ وہ کھلکھلا کر ہنس
دونوں آہستہ آہستہ چلتے سرکلر روڈ پر آئے اور وہاں سے شمیم کے گ
طرف جاتی ہوئی گلی کا موڑ مڑ گئے۔

سمیرا! شمیم کے ساتھ اس کے ہاں داخل ہوئی۔ ثمینہ برآمدے میں
پر بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ سمیرا کو دیکھتے ہی وہ اٹھی اور بھاگ کر اس سے

تھوڑی دیر وہ اسے پیار کرتی رہی۔ پھر دونوں کے ساتھ آگے بڑھی اور اسی
میرے میں داخل ہوئی جس میں وہ کچھ عرصہ قبل اجنبی ماحول میں ایک شب گزار
اندر شمیم کی امی صفیہ مسہری پر لیٹی ہوئی تھیں شمیم اس سے قریب ہوتے
ئے پُرمسرت لہجے میں بولا۔

امی! سمیرا آئی ہے۔

صفیہ اٹھی اور بڑے شوق سے پوچھا۔

کہاں ہے بیٹا ؟

یہ کھڑی ہے دیکھئے۔ شمیم نے سمیرا کی طرف اشارہ کیا۔

سمیرا آگے بڑھی۔ صفیہ نے اسے پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور اسے اپنی
باتی سے لگا کر پیار کرتے ہوئے کہا۔

بیٹی! شمیم کو نئی راہ پر لگا کر تم نے پر بہت بڑا احسان کیا ہے میں تمہاری
حد شکور ہوں۔

سمیرا نے بڑی انکساری سے کہا۔

یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں تو خود ان کی احسان مند ہوں کہ انہوں نے
ری .....

صفیہ نے لقمہ دیا۔

مجھے شمیم سب کچھ بتا چکا ہے بیٹی! اس وقت تمہاری عزت بچانا اس کا فرض
میں اس کے اس عمل سے بے حد خوش ہوں۔

سمیرا جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ ثمینہ بولی۔
باجی! چائے پیو گی یا ٹھنڈا۔
صفیہ فوراً بول اٹھی۔
ثمینہ! سمیرا بیٹی کالج سے آرہی ہے۔ پہلے جلدی جلدی کھانا تیار کر
اسے سخت بھوک لگ رہی ہوگی۔
نہیں خالہ مجھے قطعاً بھوک نہیں۔ سمیرا نے ثمینہ کو روکتے ہوئے کہا
اس دفعہ شمیم بولا۔
ہاں ثمینہ! مجھے بھی سخت بھوک لگ رہی ہے۔ جلدی کھانا تیار کرو
ثمینہ فوراً باہر بھاگ گئی۔ سمیرا ابھی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پیچھے
اور ابھی وہ کمرے سے باہر بھی نہ نکلنے پائی تھی کہ شمیم زور سے چلایا۔
سمیرا! رک جاؤ۔ سچ سخت بھوک لگی ہوئی ہے۔ کرنے دو اسے کھانا
سمیرا نے مڑ کر پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔
میں اسے کھانا پکانے سے نہیں روکتی۔ میں صرف کام میں ہاتھ بٹانے
رہی ہوں۔
تھوڑی دیر بعد سمیرا ثمینہ کے ساتھ کھانا پکانے اور گھر کے دوسرے
دھندوں میں کچھ اس طرح مصروف ہوگئی جیسے یہ گھر کسی اور کا نہیں اس کا
اپنا ہی ہو۔
کھانے کے بعد سمیرا پھر صفیہ کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کے قریب ہی شمیم

اور ثمینہ بھی علیحدہ علیحدہ کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ کچھ دیر سب ادھر اُدھر کی باتوں
میں مصروف رہے۔ آخر شمیم نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔
سمیرا! تم کہہ رہی تھیں۔ کوئی کام تلاش کیا ہے۔
ہاں ہاں! بڑا اچھا کام ہے۔ سمیرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔
مثلاً کون سا؟
میں نے ثمینہ سے بات کی تھی۔ اس نے اپنی امی کو رضامند کر لیا ہے۔ آپ
پچھلے پہر انہیں پڑھا دیا کریں۔
ٹیوشن پر کیا؟
ہاں ہاں۔
لیکن ...
لیکن ولیکن کچھ نہیں۔ میں نے بڑی مشکل سے انہیں رضامند کیا ہے۔
اب آپ انکار نہ کیجئے۔
وہ ہیں کتنی بہنیں؟
بہنیں تو وہ چار ہیں۔ سب سے بڑی کا نام خورشید ہے اور سیکنڈ ایئر میں ہے
اس سے چھوٹی پروین ہے وہ انٹر میں ہے۔ لیکن یہ دونوں بہنیں سندھ میں
اپنے ابا کے پاس رہتی ہیں۔
وہ وہاں کیا کرتے ہیں؟
ان کے نواب شاہ میں پندرہ بیس مربعے ہیں بس ان کی نگرانی کرتے ہیں

تو کیا وہ گھر اپنی امی کو ملنے بھی نہیں آتیں:

آتیں ہیں۔ لیکن دو دو تین تین سال بعد۔ اور ہاں ان دونوں سے چھوٹا کا نام ثمینہ ہے۔ جسے ہم پیار میں بالو کہتے ہیں۔ اور اس سے چھوٹی ثانیہ ہے جسے سب بے بی پکارتے ہیں۔ آپ کو صرف بالو اور بے بی کو پڑھانا ہوگا۔ وہ آپ کو ساٹھ روپے ماہوار دے دیا کریں گے۔

ان کا کوئی بھائی نہیں ہے؟

ہے۔ فسٹ ایئر میں پڑھتا ہے۔ وہ بھی ابا کے پاس سندھ میں رہتا ہے۔

سب سے بڑا ہے کیا؟

نہیں۔ خورشید سے چھوٹا اور پروین سے بڑا ہے۔ اور ہاں سب سے بڑا بھی ان کا ایک بھائی ہے اس کا نام جمشید ہے اور وہ آرمی میں کیپٹن ہے۔

بس دو ہی بھائی ہیں؟

ہاں۔

تو پھر کل سے آپ آیا کریں گے نا؟

نہیں کل تو میں ثمینہ کے ساتھ ویسے ملنے آؤں گا۔ تم پہلے بات پکی کر لو پھر میں پڑھانے آیا کروں گا

میری طرف سے تو بات پکی ہے۔ بہرحال کل میں آپ کی موجودگی میں چچی سے بھی کہلوا دوں گی۔

کمرے میں کچھ دیر سکوت رہا۔ پھر شمیم کی آواز گونجی۔

سمیرا! وہ تمہارے بھائی ہیں نا۔ کیا نام ہے ان کا۔ میں ان کا نام بھول گیا ہوں۔

سمیرا نے شوخ اور سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

سہیل؟

ہاں ہاں! وہ پڑھتے ہیں کیا؟

ہاں۔ بی اے فسٹ ایئر میں ہیں۔

سندھ میں کیا؟

نہیں۔ یہیں زمیندار کالج میں پڑھتے ہیں۔

سمیرا اٹھ کھڑی ہوئی۔

اچھا میں چلتی ہوں۔ آپ کل آئیں گے نا پھر۔

شمیم نے کرسی پر بیتابی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

بیٹھ جاؤ نا۔ کیا کرو گی جا کر۔

نہیں۔ اب چلتی ہوں۔

صفیہ بھی بول اٹھی۔

بیٹھ جاؤ نا بیٹی۔ اتنی بھی کیا جلدی ہے۔

نہیں خالہ چلتی ہوں۔ بھائی جان کالج سے لوٹ کر انتظار کر رہے ہونگے

تو کیا تم کھانا خود ہی پکاتی ہو۔

نہیں کھانا تو چچی پکا کر دیتی ہیں۔

صفیہ نے اس دفعہ شمیم سے کہا۔

جاؤ بیٹا سمیرا کو گھر چھوڑ آؤ۔

نہیں خالہ میں چلی جاؤں گی۔ ان کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں ہا

نے میز پر پڑی اپنی کتابیں اٹھاتے ہوئے کہا۔

سمیرا نے ... کتابیں جنھالیں۔ کپڑے درست کیے اور مسکرا کر شمیم کی

دیکھتے ہوئے بولی۔

کل ضرور آئیے گا۔ ہمارا گھر تو دیکھا ہوا ہے نا آپ نے ؟

نہیں تو۔

محلہ تو دیکھا ہے نا ؟

ہاں ہاں۔

وہ ٹیلی فون ایکس چینج کے پیچھے جو بڑی سی دو منزلہ عمارت ہے نا۔

جس پر جمشید منزل لکھا ہوا ہے۔

ہاں ہاں وہی۔ وہ میرے چچا کا گھر ہے۔ اس کے دائیں طرف جو سفید

عمارت ہے وہی ہمارا گھر ہے۔ آپ بہر حال چچا کے ہاں ہی آیئے گا۔ میں کل

وہیں آپ کا انتظار کروں گی۔

شمیم نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ سمیرا چند قدم دروازے

کی طرف بڑھانے کے بعد پھر واپس مڑتی ہوئی بولی۔

آپ تقریباً پانچ بجے کے قریب آیئے گا۔

شمیم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اچھا اچھا ضرور آؤں گا۔

سمیرا مکان سے باہر نکل گئی۔ شمیم اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ثمینہ پھر اسی طرح

کر پڑھنے لگی۔ اور صفیہ بستر پر دراز ہونے کے بعد نہ جانے کن کن بے ہنگم

اور غیر مسلسل خیالات کی کڑیاں جوڑنے لگی۔

۶

دوسرے روز ٹھیک پانچ بجے شمیم، ثمینہ کے ساتھ جب جمشید منزل کے بیرونی گیٹ پر پہنچا تو تحمینہ اندر سے بھاگتی ہوئی آئی اور مسکراتے ہوئے کہا۔

بھائی جان آیئے نا۔ آپ باہر کیوں کھڑے ہو گئے۔

شمیم خاموش رہا۔ تحمینہ آگے بڑھی اور بڑے پیار سے شمیم اور ثمینہ کا ہاتھ پکڑ کر ڈرائنگ روم میں لے گئی۔

تھوڑی دیر بعد سمیرا اپنی چچی تنویر اور ایک چھوٹی سی لڑکی کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ شمیم پر نگاہ پڑتے ہی وہ دنگ رہ گئی۔ شمیم ایک بے حد قیمتی اور نہایت عمدہ کٹنگ کے سوٹ میں بے حد سمارٹ اور خوب صورت دکھائی دے رہا تھا۔ سمیرا اس کے حسین سراپا میں کھو کر رہ گئی۔ لیکن تنویر کی موجودگی کے احساس نے اُسے چونکا دیا۔ وہ سنبھل کر آگے بڑھی۔ اور شمیم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

یہ ہیں میری چچی تنویر۔

شمیم نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے سلام کیا۔

سمیرا نے اس دفعہ اُس چھوٹی بچی کی طرف اشارہ کیا۔

اور یہ ہے نائلہ عنبرین جسے ہم بے بی کہتے ہیں۔

تنویر اور سمیرا کرسیاں کھینچ کر سامنے بیٹھ گئیں اور شمیم نے بے بی کو پچکار کر پیار کرتے ہوئے اپنے پاس بٹھالیا۔ جو جلد ہی اس سے کچھ اس قدر بے تکلف ہو گئی کہ لپٹ لپٹ کر شرارتیں کرنے لگی۔

تنویر تھوڑی دیر شمیم کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر کسی گہری سوچ سے نکلتے ہوتے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

شمیم! مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس سے قبل بھی تمہارے ساتھ کہیں ملاقات ہو چکی ہے۔ تمہارا چہرہ مجھے کچھ جانا پہچانا دکھائی دیتا ہے۔

شمیم نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔

میں اکثر بازار جاتا رہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہیں کہیں آپ نے اس سے پہلے دیکھا ہو۔

تنویر نے کچھ سوچتے ہوتے کہا۔

نہیں بیٹا! یوں نہیں۔ مجھے کچھ اس طرح محسوس ہوتا ہے جیسے..... ہاں ہاں یاد آیا سمیرا کا ایک خالہ زاد بھائی انجم ہے۔ تمہاری شکل اس سے بالکل ملتی جلتی ہے۔ اس کے ابا اور امی نہیں ہیں اس لئے وہ اپنی ایک اور خالہ کے پاس لاہور

رہ رہا ہے۔ اور آج کل ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ گیا ہوا ہے۔

تنویر نے کچھ رک کر کہا۔

خیر چھوڑو ان باتوں کو سمیرا مجھے تمہارے بارے میں بڑی تفصیل سے بتا چکی ہے میں تمہارے حالات سے بڑی متاثر ہوئی ہوں۔ خاص کر تمہارے اس کردار نے تمہیں اور زیادہ پُروقار اور شستہ و رفتہ بنا دیا ہے۔ کہ تم ایک بار سمیرا کی عزت بچا چکے ہو۔

شمیم کچھ کہنے کے لئے لب کھولنے ہی والا تھا کہ ڈرائنگ روم میں سمیرا کی ماموں زاد بہن کنیز اور نسرین داخل ہوئیں۔ وہ خاموش رہا اور تنویر دونوں کا اس سے تعارف کرانے لگی۔ پھر چائے کا دور شروع ہو گیا اس کے بعد کچھ یونہی ادھر اُدھر کی باتوں میں گزر گیا۔ اور پھر شمیم تنویر سے اجازت لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ تنویر اور سمیرا بیرونی گیٹ تک اس کے ساتھ آئیں اور جب شمیم مکان سے باہر نکلنے لگا تو تنویر بڑی شفقت سے بولی۔

شمیم! کل سے تحمینہ اور نائلہ کو پڑھانے آیا کرو گے نا؟

شمیم نے ہچکچاتے ہوئے کہا

جی ... ہاں ...

نہیں بیٹا! انکار نہ کرنا۔ کل سے تم ضرور آیا کرو گے۔

شمیم نے متبسم نگاہوں سے سمیرا کی طرف دیکھا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے سر کے اشارے سے ہاں کرنے کے لئے کہا اور شمیم کی مترنم آواز گونجی۔

آپ فکر نہ کیجئے میں کل سے ضرور آیا کروں گا۔

شمیم، ثمینہ کے ساتھ مکان سے باہر نکل آیا، سمیرا اور تنویر پھر ڈرائنگ روم میں چلی گئیں۔

وقت کا تیز دھارا شب و روز کو اپنے ساتھ تنکوں کی طرح بہاتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ گرمیاں سردیوں میں بدل گئیں۔ شمیم ٹیکسٹری میں بطور کلرک کام کرنے کے ساتھ ساتھ تنویر کی دونوں بچیوں کو بھی ساٹھ روپے ٹیوشن پر پڑھاتا رہا اور اس طرح وہ بڑی تیز رفتار سے ایک نئی منزل کی طرف گامزن تھا جو سماج کی نگاہوں میں نہ پسندیدہ تھی اور ہی قابل اعتراض۔

دسمبر کی وہ سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی اداس شام تھی۔ سمیرا، تنویر، تحمینہ اور نائلہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی بڑی بے چینی سے شمیم کا انتظار کر رہی تھیں۔ سات بج چکے تھے لیکن وہ ابھی تک پڑھانے نہیں آیا تھا کمرے میں گہرا سکوت اور سب کے چہروں پر اداسی سی تھی اور پھر تنویر کی آواز بلند ہوئی۔

سمیرا! شمیم ابھی تک پڑھانے نہیں آیا۔ خدا خیر کرے اس کی طبیعت ٹھیک ہو۔ نہ جانے کیا بات ہے مجھے اس سے اپنے بچوں جیسی محبت ہو گئی ہے۔ میرا دل دھڑک رہا ہے بیٹی! تم اس کے گھر جا کر اس کا پتہ تو کرو۔

سمیرا کچھ کہے بغیر فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور جب وہ ڈرائنگ روم سے نکلنے لگی۔ تحمینہ بھی اپنی جگہ سے اٹھی اور ضد کرتے ہوئے کہا۔

آپی! میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔

سمیرا واپس مڑی۔ بڑے پیار سے تحمینہ کے گال تھپتھپا کر اسے دوبارہ تھپکی جو ایک ریشمی اور قیمتی رضائی میں لپٹا بے حس لیٹا ہوا تھا۔ سمیرا نے گھبرا کر پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

بابو! تم بیٹھو میں ابھی آئی۔

تحمینہ خاموش ہو گئی۔ اور سمیرا بڑی تیزی سے باہر نکل گئی۔

سرکلر روڈ کو عبور کرنے کے بعد سمیرا جب شمیم کے گھر پہنچی تو مکان کا بیرو
دروازہ بند تھا۔ وہ بلا توقف دستک دینے لگی۔ تھوڑی دیر بعد جب دروازہ
تو سمیرا دنگ رہ گئی۔ عصمت اس کے سامنے کھڑی تھی۔ سمیرا کے منہ
بڑی حیرت سے نکلا۔

عصمت باجی! تم یہاں۔

عصمت نے بڑے اداس لہجے میں کہا۔

ہاں سمیرا! تم بڑے اچھے وقت پر پہنچ گئیں۔ میں تحمینہ کو بھیج کر تمہیں
ہی لگی تھی۔

سمیرا نے بڑی پریشانی سے پوچھا۔

کوئی خاص بات ہے کیا؟

ہاں، عصمت کا لہجہ گلوگیر تھا۔

کیا ہوا؟

تم پہلے اندر تو آؤ پھر بتاتی ہوں۔

سمیرا الجھی الجھی سی اندر داخل ہوئی۔ عصمت اسے شمیم کے کمرے میں لے گئی۔ عصمت اس درمیان میں شمیم کی مسہری کے قریب کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔

پوچھا۔

باجی انہیں کیا ہوا؟

عصمت خاموش رہی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

سمیرا بے تاب ہو گئی۔

باجی بولتی کیوں نہیں۔ کیا ہوا انہیں؟

عصمت کی طرف سے پھر کوئی جواب نہ ملا۔

سمیرا اس دفعہ آگے بڑھی اور عصمت کو شانوں سے پکڑ کر بڑی سختی سے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

باجی! خدا کے لئے کچھ تو بولو۔ کیا ہوا انہیں۔ تم چپ کیوں ہو۔

عصمت نے پھر بھی کچھ نہ کہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے جنہیں چھپانے کے لئے اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ لیکن ضبط کے باوجود بھی اس کے منہ سے آہ میں ڈوبی ہوئی ایک سسکی نکل گئی۔ سمیرا کا چہرہ بالکل پیلا پڑ گیا۔ عصمت کو چھوڑ کر وہ شمیم کی طرف بھاگی اور بڑے پیار سے انداز میں اسے جھنجھوڑنے لگی لیکن وہ بے ہوش پڑا تھا۔ سمیرا بڑی بے تابی سے اس کے چہرے پر ہاتھ لگی۔ پھر رضائی ہٹا کر اس کی چھاتی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کچھ دیر دل کی دھڑکن محسوس کی۔ آخر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹی اس کے چہرے پر اب غم کی پرچھائیاں

سمیرا بھی اس کی طرف بڑھی اور اسے جھنجھوڑ کر منت کرتے ہوئے

باجی! خدارا کچھ بولو۔ انہیں کیا ہوا۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔ ا

چپ کیوں ہو۔ اگر آپ اسی طرح چپ بیٹھی رہیں تو میں ۔۔۔۔ اس ک

غم کی گہری ہچکی میں ڈوب گئی۔

عصمت گھبرا سی گئی۔ ڈوبتی ہوئی آواز میں بولی۔

بیٹھ جاؤ سمیرا!

سمیرا کرسی کھینچ کر عصمت کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

بولئے کیا ہوا انہیں؟

عصمت کا لہجہ اداس تھا۔

سمیرا ان کے پاؤں کی رگ کٹ گئی ہے۔

باجی!

میں ٹھیک کہہ رہی ہوں سمیرا! یقین نہ ہو تو دیکھ لو۔ عصمت نے اٹھ

کے پاؤں سے رضائی سرکا دی۔ سمیرا کے منہ سے سسکی نکل گئی اس کے

پاؤں پر سفید پٹی بندھی تھی۔ جو جا بجا خون سے تر تھی۔ عصمت پاؤں ہو

کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ سمیرا نے نڈھال ہو کر اپنا سر کرسی کی پشت پر

اور ٹکٹکی باندھ کر شمیم کے اداس چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اب کیا ہوگا باجی؟

عصمت۔ اب سنبھل چکی تھی۔

تم فکر نہ کرو سمیرا۔ خدا نے چاہا تو بہت جلد ان کا پاؤں ٹھیک ہو جائیگا۔

لیکن یہ زخمی کیسے ہوئے؟

فیکٹری سے چھٹی کر کے جب یہ باہر آ رہے تھے تو ان کے آگے آگے لوہے

کے چھوٹے بڑے اور وزنی ٹکڑوں سے بھری ہوئی لوہے کی ایک ٹرالی فیکٹری

کی بھٹی کی طرف جا رہی تھی۔ جب یہ اس کے پاس سے گزرنے لگے تو ٹرالی نے

رش کی ایک ابھری ہوئی اینٹ پر سے گزرتے ہوئے ہچکولا کھایا اور لوہے کا

یک وزنی ٹکڑا شمیم کے بائیں پاؤں پر گر گیا جس سے ان کی نس کٹ گئی۔

پھر یہ گھر کیسے پہنچے؟

شمیم کے زخمی ہونے کے بعد فیکٹری کے مالک سے کہہ کر مجھے فون کرا دیا میں

وہاں پہنچی اور کار میں بٹھا کر شمیم کو کلینک لے گئی۔ اور وہاں اچھی طرح مرہم

کرنے کے بعد یہاں لے آئی۔

سمیرا نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

باجی! صفیہ خالہ اور ثمینہ کہاں ہیں۔

شمیم کو کلینک کے پچھلے کمرے میں لٹا کر میں صفیہ خالہ کو بھی یہاں سے لے

کلینک کے ایک دوسرے کمرے میں لٹا دیا۔ اور شمیم کو میں یہاں لے آئی

وہ میری نرس عالیہ کی نگرانی میں ہیں۔

سمیرا نے حیرت سے پوچھا۔

لیکن آپ انہیں وہاں کیوں لے گئیں؟

سمیرا! انہیں ٹی بی ہے میں نہیں چاہتی کہ انہیں شمیم کے زخمی ہونے کا پتہ چلے۔ جب تک ان کا پاؤں ٹھیک نہیں ہوتا وہ میرے کلینک میں ہی رہیں گی۔ ثمینہ بھی انہیں کے پاس ہے۔ نو بجے تک واپس آئے گی۔

اور اُن کے پاس کون رہے گا۔

میں جو ہوں۔

کمرے میں چند لمحے اداس سا سکوت رہا۔ آخر عصمت بولی۔

سمیرا تم بیٹھو۔ میں شمیم کے لئے دودھ گرم لاؤں۔

سمیرا نے عصمت کا ہاتھ پکڑ لیا۔

نہیں باجی! تم بیٹھو میں دودھ گرم کرتی ہوں۔

عصمت نے پھر اسے پکڑ کر اپنی جگہ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

تم بیٹھو سمیرا میں خود دودھ گرم کرتی ہوں۔ ہاں ٹھہرو میں شمیم کو تمہاری

سے مطلع کرتی ہوں۔

رہنے دیجئے باجی وہ تو۔

نہیں سمیرا یہ بے ہوش نہیں ہیں۔ صرف مارفیا کے ٹیکہ سے کچھ غنودگی سی

عصمت، شمیم کی طرف بڑھی اور اس کی ٹھوڑی پکڑ کر آہستہ آہستہ اس

چہرہ دائیں بائیں ہلانے لگی۔ تھوڑی دیر شمیم نے آنکھیں کھول دیں۔ اور عصمت

حسین چہرے پر خوشگوار مسکراہٹ لئے بڑی شوخ نگاہوں سے اس کی طرف

ہوتے بولی۔

شمیم! دیکھو تو کون آیا ہے؟

شمیم نے دو تین بار آنکھیں جھپکیں پھر بڑی معصومیت سے پوچھا۔

کون آیا ہے عصمت؟

عصمت نے سمیرا کی طرف اشارہ کیا۔

وہ دیکھو کون بیٹھا ہے؟

شمیم نے سمیرا کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا لیکن اس

کی حالت زار دیکھ کر سمیرا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ شمیم اسے کچھ کہنے ہی

والا تھا کہ عصمت بولی۔

سمیرا تم ذرا شمیم کے قریب ہو کر بیٹھ جاؤ۔ میں ذرا دودھ گرم لاؤں۔

عصمت باہر نکل گئی اور سمیرا کرسی کھینچ کر شمیم کے قریب ہو بیٹھی کمرے

میں دو تین منٹ سوگوار سی خاموشی رہی آخر شمیم نے پُر درد لہجے میں پوچھا۔

سمیرا تم رو کیوں رہی ہو ساتھ ہی اس نے سمیرا کا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔

سمیرا نے ہلکی سی سسکی لی پھر جلد ہی سنبھل کر بولی۔

آپ نے یہ اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے؟

پگلی معمولی سا زخم ہے۔ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ تم رو کیوں رہی ہو۔

سمیرا نے کچھ کہے بغیر انگیا میں اڑسا ہوا رومال نکالا اور شمیم کی پیشانی پر

خون کے چند داغ صاف کرنے کے بعد رومال اس کے تکیہ پر ہی رکھ کر ایک

ہاتھ شمیم کے ہاتھوں ہی میں رہنے دیا اور دوسرے ہاتھ سے شمیم کے بالوں میں

کنگھی کرنے لگی۔

شمیم پھر بولا۔

سمیرا! کب سے آئی بیٹھی ہو؟

ابھی ابھی آئی ہوں۔

میرے زخمی ہونے کا کیسے پتہ چلا؟

یہاں آکر پتہ چلا۔ میں تو ویسے ہی آپ کے وہاں نہ جانے کی وجہ سے آپ کا
معلوم کرنے آگئی تھی۔

اکیلی ہی آئی ہو کیا؟

جی۔

بابو اور بے بی کو ساتھ لیتی آئی ہوتیں۔

وہ تو لصد تھیں۔ میں خود ہی نہیں لائی۔ ویسے چچی اور وہ دونوں بہنیں آپ
کی غیر حاضری کی وجہ سے سخت پریشان ہیں۔

عصمت گرم گرم دودھ سے بھرا ہوا گلاس اٹھائے اندر داخل ہوئی شمیم
کوئی جواب دینے کے بجائے خاموش ہی رہا۔ لیکن سمیرا فوراً اپنے ہاتھ جلد
کر کے روئے سخن بدلتے ہوئے بولی۔

زیادہ تکلیف تو نہیں ہو رہی ہے؟

شمیم اس کی حاضر دماغی پر مسکرانے لگا۔

نہیں کوئی خاص نہیں! عصمت نے جو انجکشن دیئے ہیں ان کی وجہ سے

کافی حد تک آرام ہے۔

عصمت بھی قریب پہنچ گئی اور دودھ کا گلاس شمیم کی طرف بڑھاتے ہوئے
کہا۔

شمیم اٹھو دودھ پیو۔

شمیم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لیکن سمیرا نے عصمت کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس لے لیا
بایاں ہاتھ سہارے کے طور پر شمیم کے سر کے پیچھے رکھا اور دائیں ہاتھ سے اُسے
دودھ پلانے لگی۔ عصمت چپ چاپ واپس مڑ کر پھر باورچی خانہ کی طرف چلی گئی۔
شمیم دودھ پی چکا تھا۔ سمیرا نے خالی گلاس لے کر ایک طرف رکھ دیا۔ کافی
دیر تک وہ اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے کے علاوہ اس کے بالوں میں کنگھی
کرتی رہی۔ عصمت اس دوران باورچی خانہ میں رہی۔ اچانک سمیرا نے اپنی کلائی پر
بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ باہر فضا میں گھپ اندھیرا پھیل
چکا تھا۔ سمیرا نے گھبرا کر اس کے چہرے پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

شمیم! ساڑھے آٹھ بج چکے ہیں میں اب چلتی ہوں۔ کاش میں مجبور نہ ہوتی تو
ساری رات تمہارے پاس ہی رہتی۔

شمیم نے بڑے پیار سے کہا۔

نہیں سمیرا تم جاؤ۔ تمہیں یہاں رات نہیں رہنا چاہیئے۔ مجھے تمہاری مجبوری
کا احساس ہے۔ عصمت میرے پاس ہے اور پھر اب مجھے کوئی خاص تکلیف بھی
نہیں ہے .... اور ہاں کل آؤ گی نا؟

ضرور! کل تو ہے ..... چچی، بابو اور بے بی کو بھی ساتھ لاؤں گی۔

شمیم پہ رضائی درست کرتی ہوئی سمیرا اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک آخری ا
بھری نگاہ شمیم پر ڈالی اور پھر خالی گلاس اٹھائے کمرے سے باہر نکل کر۔ باورچی
میں داخل ہوئی۔ اندر بیٹھی ہوئی خیالات میں غرق عصمت چونک پڑی۔ سمیرا
گلاس اس کے پاس رکھتے ہوئے گہری نگاہوں سے اسے دیکھ کر پوچھا۔

کیا کر رہی ہو باجی؟

دودھ کچا پڑا تھا میں نے سوچا گرم کر دوں۔ عصمت نے دھیمی آواز
جواب دیا۔

سمیرا اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

میں جا رہی ہوں باجی۔ کاش میں آپ کے ساتھ یہاں رہ سکتی۔ نہیں ہم
تم جاؤ۔ تمہارے حالات ابھی ایسے نہیں کہ یہاں رہ سکوں۔ پھر میں جو ہوں یہا
تمہیں کوئی فکر نہ کرنا چاہیئے۔

باجی ..... سمیرا کے ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ گئے
عصمت کی آنکھوں میں آنسو چھلک گئے۔

سمیرا! میں تمہارے حالات سے باخبر ہوں۔ میں شمیم سے محبت ضرور کرتی
لیکن وہ تمہیں چاہتے ہیں۔ وہ تمہاری امانت ہیں۔ میں تمہارے راستے کی رکا
نہیں بنوں گی۔ سمیرا! میں وعدہ کرتی ہوں ایک ہمدرد کے رشتے سے آگے بڑ
کی کبھی کوشش نہ کروں گی۔ شمیم تمہارا ہے اور ہمیشہ تمہارا رہے گا۔

سمیرا رو پڑی اور زور سے "باجی" کہتی ہوئی عصمت سے لپٹ گئی۔

عصمت نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ اس کا سر اپنی گود میں لے کر ایک ہاتھ اس
کے سر پر پھیرتے ہوئے پیار کرنے لگی اور دوسرے ہاتھ سے اپنے بہتے ہوئے
آنسو خشک کرنے لگی۔

تھوڑی دیر ایسا ہی سماں رہا۔ پھر سمیرا علیحدہ ہو گئی اور رومال سے اپنے آنسو پونچھتے
ہوئے کہا۔

میں چلتی ہوں باجی! بہت دیر ہو گئی ہے۔

عصمت بڑی شفقت سے بولی۔

میری کار باہر ہی کھڑی ہے چلو میں تمہیں گھر تک چھوڑ آتی ہوں۔

نہیں باجی! آپ تکلیف نہ کیجئے۔ آپ یہیں ان کے پاس ہی رہیے میں
اکیلی چلی جاؤں گی۔

سمیرا باہر نکل گئی۔ اور عصمت جانے کا اس بیل کی طرح الجھے ہوئے کن خیالوں میں الجھ کر رہ گئی۔

۷

دوسرے روز اتوار تھا۔ سمیرا، تنویر، ثمینہ، نائلہ اور سمیرا کا بھائی سہیل شمیم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ قریب ہی عصمت اور ثمینہ بھی بیٹھی تھیں۔ عصمت کی آنکھیں ساری رات بیداری کے سبب نیند آلود تھیں۔ اور وہ بار بار کرسی پر بیٹھی بیٹھی اونگھنے لگتی۔ سب اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف تھے۔ شمیم کی طبیعت بھی کچھ بہتر تھی اور وہ بھی باتوں میں برابر کا حصہ لے رہا تھا۔

عصمت نے ایک بار اونگھتے ہوئے جب اپنا سر کرسی کی پشت پر رکھ دیا تو سمیرا مسکراتے ہوئے بولی۔

باجی! آپ کو نیند آ رہی ہے۔ اٹھئے سو جائیے آ کر۔

عصمت فوراً سنبھل گئی۔

نہیں سمیرا! سو جاؤں گی دوپہر کو۔ ابھی طبیعت نہیں چاہ رہی۔

تو پھر آپ بیٹھئے میں چلتی ہوں۔

کہاں؟

خالہ کے پاس۔

ہاں ہو آؤ۔

اور ہاں۔ شمیم کا اگر وہ پوچھیں تو کہنا کہ وہ دس بارہ دن کے لئے فیکٹری کے کام کراچی گئے ہوئے ہیں۔ میں نے ان کے سامنے یہی بہانہ جوئی کی تھی۔ عالیہ کو بھی میں اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔

اچھا! میں بھی یہی کہہ دوں گی۔

سمیرا اٹھ کھڑی ہوئی اور تنویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

چچی! آپ چلئے گھر۔ میں ذرا ان کی امی سے مل آؤں۔

کہاں ہیں وہ؟ تنویر نے پوچھا۔

عصمت باجی کے کلینک میں۔

ہو آؤ تم۔ میں بھی چلتی ہوں گھر۔

ثمینہ فوراً اٹھی اور سمیرا کا دوپٹہ پکڑتے ہوئے کہا۔

آپی! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔

سمیرا اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

اچھا چلو۔

تنویر، سہیل اور نائلہ کے ساتھ گھر چلی گئی۔ اور سمیرا تحمینہ کو ساتھ لے کر عصمت کے کلینک کی طرف چل دی۔

سمیرا تحمینہ کے ساتھ جب عصمت کے کلینک کے بڑے کمرے میں پہنچی تو ریشمی پردے کے پیچھے ایک دوسرے کمرے میں داخل ہوئی تو صفیہ لوہے کی چارپائی پر ایک صاف ستھرے اور نرم و گداز بستر پر بڑی ٹکٹکی باندھے چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ قریب ہی عصمت کی نرس عالیہ کرسی پر خاموش بیٹھی تھی۔ تحمینہ کا ہاتھ کا ہاتھ پکڑے سمیرا جب مسہری سے ذرا قریب ہوئی عالیہ اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی بولی۔

آیئے! مس سمیرا

سمیرا کا نام سن کر صفیہ چونک کر سامنے دیکھنے لگی۔ سمیرا کو اپنے قریب دیکھ کر بڑے پیار سے کہا۔

آؤ سمیرا بیٹی۔

سمیرا کرسی کھینچ کر خاموشی سے بیٹھ گئی۔

صفیہ پھر بولی۔

اچھی تو ہو بیٹی؟

اللہ کا احسان ہے خالہ اپنی سنایئے۔

بس دن کاٹنے والی بات ہے۔ صفیہ کی آواز رندھ گئی، لیکن جلد ہی وہ سنبھل گئی۔ اور تحمینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

یہ کون ہے۔؟

میرے چچا کی لڑکی تحمینہ۔

صفیہ، تحمینہ کو پکڑ کر پیار کرنے لگی۔ اس دوران میں عالیہ سمیرا سے مخاطب ہوئی۔

آپ بیٹھیں گی کچھ دیر؟

سمیرا نے بغور عالیہ کی طرف دیکھا۔

کیوں کہیں جاؤ گی۔؟

ہاں! میں ذرا بازار جاؤں گی۔

ہوا آؤں میں بیٹھوں گی۔ لیکن جلد واپس لوٹنا۔

عالیہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کلینک سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

میں پانچ منٹ میں واپس آئی۔

کمرے میں اداس سی خاموشی چھا گئی۔ لیکن جلد ہی سمیرا نے قفلِ سکوت توڑا اور صفیہ سے مخاطب ہوئی۔

خالہ آپ کی صحت تو پہلے سے بھی گرتی جا رہی ہے۔ میری صلاح ہے شمیم واپس لوٹے تو آپ کو سینی ٹوریم بھجوا دیں۔

صفیہ اداس ہو گئی۔

میں نے خود سوچا ہے بیٹی! میرے یہاں رہنے سے شمیم کو بھی مشکلات کا سامنا ہے۔ اس کے علاوہ عصمت کا بھی بہت مالی نقصان ہو رہا ہے۔ لیکن وہ احمق تو مجھے بتائے بغیر ہی کراچی چلا گیا۔ صرف جاتی دفعہ عصمت کو فون پر اپنے جانے کی اطلاع دی تھی۔

انہیں بہت جلدی جانا پڑ گیا ہوگا۔ ورنہ وہ ضرور آپ کو بتا کر جاتے۔

صفیہ نے ایک لمبی سانس لی۔

ہاں بیٹی میرا بھی یہی خیال ہے۔

تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد سمیرا نے پھر بات شروع کی۔

خالہ برا نہ مانئے تو ایک بات پوچھوں؟

صفیہ نے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔

پوچھو بیٹی! میں تمہاری بات کا کیوں برا ماننے لگی۔

کیا آپ کا کوئی . . .

صفیہ نے پھر تسلی دی۔

کہو کہو۔ رک کیوں گئیں۔

سمیرا نے کچھ سوچ کر کہا۔

کیا آپ کا کوئی رشتہ دار نہیں؟

صفیہ کا رنگ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔

ہیں۔ لیکن . . .

سمیرا نے حیرانگی سے پوچھا۔

لیکن کیا؟

آج سے تیرہ سال قبل میں اپنے شوہر کے ساتھ بڑی خوشگوار زندگی بسر کر رہی تھی۔ وہ شہر کے کامیاب ترین ڈاکٹر تھے اس کے علاوہ میرے بھائی تھے نہیں تھیں۔ پڑھائی جاری رکھنے کے لئے اسے اسکول میں داخل کرا دیا۔ خود ایک ہائی سکول میں

سب کچھ ہی تو تھا۔ لیکن تقدیر نے میرا ساتھ نہ دیا میری بڑی بہن پر ایک آدمی نے بدکرداری کا الزام لگایا۔ میرے شوہر نے طیش میں آکر اسے قتل کر دیا اور خود فرار ہو گئے۔

اس سے آگے صفیہ رک گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور جسم پر جیسے رعشہ طاری ہو گیا ہو۔

سمیرا نے بے تاب ہو کر روہانسی آواز میں کہا۔

پھر کیا ہوا خالہ؟

صفیہ نے اپنی ہچکیاں روک لیں اور آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

فرار ہونے کے بعد وہ پولیس اور حتیٰ کہ سب رشتہ داروں سے چوری چوری رات گھر آ کر میرے پاس گزارتے۔ لیکن جلد ہی انہیں گرفتار کر لیا گیا اور پھانسی کی سزا دے دی گئی۔

صفیہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سمیرا کی آنکھیں بھی آنسو بہانے لگیں۔

آخر صفیہ پھر بولی۔

ان کی موت کے آٹھ ماہ بعد میرے ہاں شمینہ ہوئی۔ پورے خاندان حتیٰ کہ میرے سگے بہن بھائیوں نے مجھ پر بدکرداری کا الزام لگایا میں تنگ آ کر گھر کی ساری نقدی زیورات اور چیک بکس کے علاوہ شمیم اور شمینہ کے ساتھ فرار ہو کر لاہور چلی گئی۔ اور ایک صاف ستھرے محلے میں ایک کرائے مکان میں رہنے لگی۔ اور شمیم کی

۸

شمیم کا زخم ٹھیک ہوگیا۔ صفیہ عصمت کے کلینک سے گھر چلی آئی۔ شمیم کے واپس آنے والے دن سمیرا، تحمینہ اور نائلہ کھڑی ہیں۔ تم اب اکیلی جاؤ میں اسی طرح معمول کے مطابق صبح ہی صبح ثمینہ کو لے کر سمیرا کے گھر کے قریب تک چھوڑنے جاتا اور وہاں سے سمیرا اسے تحمینہ اور نائلہ کے ساتھ سکول کر کالج چلی جاتی پھر وہ فیکٹری اور وہاں سے واپسی پر تحمینہ اور نائلہ کو لے کر ثمینہ واپس چل دیا۔ اور ثمینہ بھاگتی ہوئی زور زور سے پکارنے لگی۔ کے ہاں چلا جاتا۔

بوا بے بی!

دن گزرتے رہے۔ سردیاں ختم ہوگئیں۔ بہار اپنی تمام رنگینیاں لے کر جب بھاگتی ہوئی ٹیلی فون ایکس چینج کی عمارت کے سامنے سے ہوئی۔ اور گل و بلبل کی موجودگی کی پرواہ کئے بغیر اپنے جسم سے ایک ایک لگی تو اندر سے ایک کار بڑی تیزی سے نکلی اور سب کپڑے اتار پھینکے۔ اور پھر اس کا عریاں، سفید اور چکنا جسم ایک رنگین سے رقص کرتے ہوئے دعوت وصل دینے لگا درختوں اور پودوں میں گھومتی ہوئی اس کے اوپر سے گزر گئی۔ فضا میں ایک دل دوز

اور جگر پاش چیخ بلند ہوئی۔ شمیم نے جونہی مڑ کر پیچھے دیکھا ثمینہ خون
پت سڑک پر پڑی تھی اور کار اس سے چند قدم کے فاصلے پر رکی کھڑی
اچانک دور کھڑی سمیرا چلائی۔

ثمینہ !!

اور پھر وہ بے تحاشا سڑک پر پڑی ثمینہ کی طرف بھاگ کھڑی ہوا

شمیم نے جو یہ منظر دیکھا تو پُر درد لہجے میں "ثمینہ" "ثمینہ"
اس کی طرف بھاگنے لگا۔

ڈرائیور نے کار سے نکل کر ثمینہ کو سنبھالا۔ اور جب شمیم بھاگتا ہوا
تو ثمینہ اس سے لپٹ لپٹ گئی اور اپنے ہاتھ شمیم کے چہرے پر پھیرتے
لہجے میں پکارنے لگی۔

بھیا ! بھیا مجھے بچا لو۔ خدا کے لئے مجھے بچا لیجئے بھائی جان۔

اتنی دیر تک سمیرا بھی پہنچ گئی۔ شمیم سے لے کر ثمینہ کو اس نے اپنی
لیا۔ ثمینہ اور نائلہ قریب بیٹھ کر رونے لگیں۔ سب کے کپڑے خون آلود ہو
کسی کو کچھ ہوش نہ تھا۔ آخر ڈرائیور نے شمیم کو شانے سے پکڑ کر چونکا
وقت ضائع نہ کیجئے بچی کو جلدی جلدی ہسپتال پہنچائیے۔ پہلے ہی
بہہ چکا ہے۔ آیئے میرے ساتھ۔ اس نے آگے بڑھ کر کار کے دروا
شمیم ثمینہ کو لے کر اندر بیٹھ گیا۔ سمیرا ثمینہ اور نائلہ بھی اس کے ساتھ بیٹھ
پھر سمیرا کے کہنے پر کار بڑی تیزی سے عصمت کلینک کا رخ کر رہی تھی

خون میں نہائی ہوئی ثمینہ کو اٹھائے ہوئے شمیم جب عصمت کے کلینک میں داخل
دھڑ اکر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور آگے بڑھ کر اس سے پوچھا۔
شمیم ! کیا ہوا ثمینہ کو۔ اس کی آواز میں درد اور سوز تھا۔
شمیم جس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے کچھ نہ کہہ سکا۔ لیکن سمیرا اپنی پرنم
میں صاف کرتی ہوئی بولی۔
ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے باجی ! ذرا جلدی جلدی اسے سنبھالئے پہلے ہی کافی خون
بہہ چکا ہے۔
ثمینہ کو چارپائی پر لٹا کر جب شمیم پیچھے ہٹا تو ثمینہ نے اسے ہاتھ سے پکڑ
لرزتی ہوئی آواز میں رک رک کر کہا۔
کہاں چلے ہو بھیا۔ یہیں رہو... میں... میں مر جاؤں گی بھیا کہیں نہ جاؤ
تو۔
سمیرا نے فوراً آگے بڑھ کر اس منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔
چپ رہو ثمینہ۔ خدا کے لئے چپ رہو... ایسی مایوسی کی باتیں نہ کرو۔ میرا
ل... سمیرا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ثمینہ اور نائلہ بھی سسکیاں لینے لگیں۔
ثمینہ نے سمیرا کو بھی پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ اتنی دیر عصمت بھی آگے بڑھی
بھی اس نے ثمینہ کے زخم دیکھنا ہی چاہے تھے کہ ثمینہ نے چند لمبے لمبے سانس
اور... پھر
پھر...

ایک دل خراش منظر کے ساتھ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی
موت کی بھیانک، پر خار اور انجانی وادیوں میں کھو کر رہ گئی۔ سمیرا اور عصمت
مار مار کر رونے لگیں تحمینہ اور نائلہ ثمینہ کی لاش سے لپٹ لپٹ گئیں اور
بے بسی سے بڑبڑانے لگا۔

ثمینہ... ثمینہ مر گئی کیا؟ کیا... کیا۔ اور پھر وہ لوہے کی مہری پر
سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ سارا کلینک آہ وزاری سے گونج اٹھا۔

ثمینہ کی لاش عصمت کی کار میں جب گھر پہنچائی تو صفیہ کا جیسے دل
گیا۔ اور وہ رو رو کر بے ہوش ہو گئی۔

جو ہونا تھا سو ہو چکا اور شام سے قبل ثمینہ سپرد خاک کر دی گئی۔

عصمت، شمیم کے پاس رات اس کے ہاں ہی رہی۔ لیکن سمیرا کافی رات
بعد گھر واپس چلی گئی۔ ثمینہ کی موت کی وجہ سے گھر میں مایوسیاں اور اداسیاں رقص
کرنے لگی تھیں۔

رات کسی نہ کسی طرح بیت گئی۔

دوسرے روز سمیرا جب پھر شمیم کے ہاں گئی تو صفیہ اپنے کمرے میں سوئی پڑی
تھی اس نے شمیم کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ نہ جانے کن سوچوں میں غرق کرسی پر بیٹھا تھا
اس کے قریب ہی عصمت بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ سمیرا خاموشی سے آگے بڑھ کر دونوں
کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

تینوں کچھ دیر خاموش رہے پھر عصمت دھیمی سی آواز میں بولی۔

شمیم! اٹھو غسل کرو۔ ناشتہ تیار رکھا پڑا ہے۔

شمیم نے کوئی جواب نہ دیا۔ سر جھکائے اسی طرح بیٹھا رہا۔

عصمت نے اس بار اس کا شانہ پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

میں کیا کہہ رہی ہوں۔

شمیم نے سر اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ جنہیں چھپانے
کے لئے اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ عصمت کا دل بھی بھر آیا اور ہونٹ بھینچ
بھینچ کر اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ سمیرا یہ منظر دیکھ کر بیتاب
ہو گئی۔ فوراً اپنی جگہ سے اٹھی اور شمیم کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اوپر اٹھاتے ہوئے پرسوز
آواز سے کہا۔

اٹھئے غسل کیجئے اٹھ کر۔

شمیم اٹھ کر رومال سے آنکھیں صاف کرتا ہوا غسل خانہ کی طرف چلا گیا۔ اور
سمیرا کرسی کھینچ کر عصمت کے سامنے بیٹھ گئی۔ دونوں تھوڑی دیر بڑی افسردگی سے
ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ اور سمیرا نے اس دوران کچھ سوچتے ہوئے لرزتی سی

آواز سے کہا۔

اب کیا ہوگا باجی! اب اس گھر کا سلسلہ کیسے چلے گا۔ پہلے تو ثمینہ سب کام کرتی تھی۔

عصمت کے چہرے پر اداسی کی اوس برسنے لگی۔

میں بھی اسی الجھن میں پڑی ہوئی ہوں سمیرا! سوچتی ہوں صفیہ خالہ کو سمجھا کر دوں۔ اور شمیم کو اپنے گھر لے جاؤں۔

بہت اچھا خیال ہے باجی! لیکن شمیم شاید ...

عصمت اچانک اس کی بات کاٹتے ہوئے چونک کر بولی۔

سمیرا! کیا بات ہے تمہاری چچی نہیں آئیں۔؟

وہ سخت بیمار ہیں باجی! چل تک نہیں سکتی ہیں۔ ثمینہ کی موت کا انہیں بہت افسوس ہے۔ مجھے تو وہ کہہ رہی تھیں کہ شمیم کی امی کو ہسپتال میں داخل کرانے کے بعد شمیم کو وہ اپنے ہاں لے جائیں گے۔

لیکن یہ سب کچھ کرنے سے پہلے شمیم کا عندیہ لینا پڑے گا۔

میں بھی آپ سے یہی کہنے والی تھی۔ اور ہاں باجی! اتنے دن ہوئے آپ سے ملاقات ہوئے آپ نے ابھی تک اپنا گھر تو دکھایا ہی نہیں۔

اچھا میں کسی دن تمہیں ساتھ لے کر چلوں گی۔ اگر مجھے یاد نہ رہا تو تم مجھے یاد دلا دینا۔

کدھر ہے آپ کا گھر؟

کچہری روڈ پر گورنمنٹ سکول کے بائیں جانب ایک دو منزلہ سفید کوٹھی ہے نا؟

ہاں۔ ہاں۔

بس وہی میرا گھر ہے۔

نہیں تم رہنے دینا۔ اکیلی نہ آنا۔ میں شمیم سے کہوں گی وہ کسی دن تمہیں ساتھ لے آئے گا۔

وہ آپ کے ہاں آتے جاتے ہیں کیا؟

ہاں۔ ہاں۔ ہفتہ میں ایک دو دفعہ تو ضرور جاتے ہیں۔ میری امی تو انہیں اپنی اولاد سے بھی زیادہ چاہتی ہیں۔

آپ گھر کے کتنے فرد ہیں۔

کل تین۔ ایک امی، ایک بھائی اور میں۔

بھائی جان کیا کرتے ہیں؟

آرمی میں کرنل ہیں۔

ان کے بیوی بچے یہیں ہیں کیا؟

نہیں انہوں نے راولپنڈی میں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔

تو پھر آپ کی امی گھر اکیلی ہی رہ جاتی ہوں گی۔

نہیں ان کے پاس دو ملازمائیں ہیں۔ جو ہر وقت ان کا دل بہلانے کی کوشش کرتی ہیں۔

شمیم غسل کر کے اندر داخل ہوا۔ سمیرا خاموش ہو گئی۔ عصمت اٹھ کر شمیم کے

لئے ناشتہ نکالنے لگی۔ سمیرا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

باجی! خالہ جان کو بھی جگا لیجئے۔ انہوں نے بھی ناشتہ نہیں کیا ہوگا ابھی تک۔

عصمت، شمیم کے سامنے برتن جاتے ہوئے بولی۔

نہیں سمیرا، انہیں سونے دو۔ وہ ساری رات کھانسی کے سبب جاگتی رہی ہیں

شمیم ناشتے کے بعد جب پھر سمیرا کے آکر بیٹھ گیا۔ تو عصمت نے پھر وہی زیر بحث موضوع چھیڑا!

شمیم میری صلاح ہے کہ خالہ کو سینی ٹوریم لے جائیں۔ اور تم میرے ہاں چلو۔ یہ سروس چھوڑ دو۔ اس جیسی چھوٹی سی سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ پہلے اپنا مستقبل سنوارنے کے لئے ایم۔ بی۔ بی ایس کرلو۔

شمیم نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ خلاؤں میں گھورتے ہوئے کچھ سوچے بغیر کہا۔

نہیں عصمت! ایسا ناممکن ہے۔ پہلے شاید اگر میں کوشش کرتا تو ایم۔ بی۔ بی ایس کرلیتا۔ لیکن اب تو گھر کے حالات اور زیادہ پیچیدہ ہوگئے ہیں۔

کچھ فرق نہیں پڑا۔ امی سینی ٹوریم چلی جائیں گی۔ آپ کالج میں داخلہ لے لیں۔

اخراجات کہاں سے پورے ہوں گے۔؟

عصمت جو ہے۔

اول ہوں۔ میں پہلے ہی تمہارا زیر بار احسان ہوں۔ اب میرے کندھوں پر اور بوجھ نہ ڈالو۔

کوئی بوجھ نہیں ہے۔ ضرورت کے وقت کام آنا انسانی فرض ہے۔

لیکن حد سے زیادہ نہیں۔

سب آپ کی خیال آرائیاں ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اس قدر ظاہرداری کیوں برتتے ہیں۔

اس لئے کہ بہتری اسی میں ہے۔

بالکل غلط۔ بہتری تو اسی میں ہے کہ آپ کالج میں داخلہ لے لیں سچ کہتی ہوں پچھلی بار جب آپ ہمارے ہاں سے واپس لوٹے تھے تو امی کہہ رہی تھیں کہ شمیم گر کالج میں داخلہ لے لے تو سب اخراجات میں پورے کروں گی۔

یہ تو ان کی غم گساری اور شفقت پدری ہے عصمت! برتن کا منہ کھلا ہو تو ڈھکنے کو شرم آنی چاہیے۔

عصمت نے تنگ آکر کہا۔

اچھا اگر تم نہیں مانتے تو ایک کام تو کرو نا۔

شمیم نے بڑے دل پسند انداز سے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

وہ کیا؟

خالہ کو سینی ٹوریم تو بھجوا دیجئے نا۔

لیکن اس صورت میں مجھے ان کے پاس رہنا پڑے گا۔ اور اس طرح اخراجات کا مسئلہ پھر سامنے آکھڑا ہوگا۔

وہ میں بندوبست کر لوں گی۔

کیا؟

ان کی نگرانی کے لئے میں اپنی نرس عالیہ کو بھیج دوں گی۔

اس طرح تمہارا کام رک جائے گا۔

میرے پاس دوسری نرس جو ہے۔

ایک سے کیا کام چل جائے گا تمہارا۔؟

نہ چلا تو بھی چلا لوں گی۔ ضرورت پڑنے پر سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔

ٹھیک ہے اگر تم ایسا چاہتی ہو تو مجھے منظور ہے۔

پھر کب لے چلیں خالہ کو؟

جب تمہارا جی چاہے۔

عصمت نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔

خدا کا شکر ہے ایک مسئلہ تو طے ہوا۔ خالہ کو ہم کل ہی لے چلیں گے۔ اب آپ صرف ایک بات اور مان جائیے۔

شمیم نے گہری نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

کیا؟

خالہ کے سینی ٹوریم چلے جانے کے بعد آپ ہمارے ہاں رہیے۔

شمیم نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

یہ نہیں ہو سکتا۔

عصمت کی جگہ اس دفعہ سمیرا بولی۔

ٹھیک ہے۔ اگر آپ وہاں نہیں رہنا چاہتے تو تنویر چچی کے ہاں رہیے۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ شمیم کی امی اگر سینی ٹوریم چلی جائیں تو شمیم ہمارے ہاں آ کر رہے۔

نہیں سمیرا ایسا بھی نہیں ہو سکتا۔ میں۔ میں اکیلا یہیں رہوں گا۔

عصمت نے جھلا کر کہا۔

تو کھانا کہاں سے کھائیں گے آپ؟

شمیم نے بغیر توقف کے کہا۔

ہوٹل سے۔

میری بے عزتی ہے اس میں۔

کوئی بے عزتی نہیں۔ میرے جیسے اور بہت سے لوگ وہاں سے کھاتے ہیں۔ لیکن تم گھر پر اکیلے پڑے پڑے گھبرا جایا کرو گے شمیم۔

مجھے گھبرانے کا وقت ہی کہاں ملے گا۔ فیکٹری سے چھٹی کے بعد تنویر چچی کے ہاں چلا جایا کروں گا۔ اس کے بعد فاضل وقت تمہارے کلینک میں یا تمہاری امی کے پاس گزار دیا کروں گا۔

عصمت نے بیقراری سے کرسی کے بازو پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

اچھا بابا! تم جیتے میں ہاری۔ تم دونوں بیٹھو میں ذرا کلینک ہو آؤں۔ آدھ گھنٹے تک واپس لوٹ آؤں گی۔

کیا کرنے جاؤ گی؟

عالیہ خالہ کے ساتھ جائے گی نا اسے تیاری کرنے کے لئے کہوں گی۔

عصمت اُٹھ کر باہر نکل گئی۔ شمیم اور سمیرا تھوڑی دیر ایک دوسرے کو میٹھی میٹھی نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ اتنی دیر میں ساتھ والے کمرے سے صفیہ کے پانی مانگنے کی آواز سنائی دی۔ اور دونوں اٹھ کر اس کمرے میں چلے گئے۔

۹

صفیہ کو سینی ٹوریم گئے تین ماہ بیت گئے۔ شمیم کی زندگی کے وہی معمولات تھے۔ صرف بہن کی موت اور ماں کی جدائی نے اسے کسی حد تک سنجیدہ بنا دیا تھا۔ وہ بہت کم بولتا۔ اگر کسی موضوع پر کچھ کہتا بھی تو بس یوں ہی بجھی بجھی سی طبیعت کے ساتھ عصمت کے بار بار منع کرنے کے باوجود بھی اس نے کھانا ہوٹل سے کھانا شروع کر رکھا تھا۔ عصمت کو اس پر افسوس بھی تھا اور شکوہ بھی۔ لیکن وہ کچھ مانے بغیر اپنی ہی کئے جا رہا تھا۔

مکان کو آفس جاتے وہ مقفل کر جاتا۔ ایک چابی اس کے پاس رہتی اور دوسری مستقلاً عصمت کو دے دی گئی۔ جس سے اس کی ملازمہ شمیم کے آفس جانے کے بعد ہر روز گھر کی اچھی طرح صفائی کر دیتی۔

ایک روز فیکٹری میں کام کے بعد شمیم جب عصمت کے کلینک میں داخل ہوا تو وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کئے نہ جانے کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ کلینک میں کوئی مریض نہ تھا صرف اس کی نرس فوزیہ سٹور روم میں دوائیاں بنانے میں مصروف تھی۔

شمیم کھنکارتا ہوا اندر داخل ہوا۔ عصمت فوراً چونکی اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔ شمیم چند قدم آگے بڑھا اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔

نیند ہو رہی ہے کیا؟

عصمت نے اپنی ساڑھی کا پلو درست کرتے ہوئے کہا۔

نہیں ایسے ہی آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔

شمیم نے اس دفعہ از راہ مذاق کہا۔

آج مریض کوئی نہیں آیا ہوگا۔؟

عصمت کھلکھلا کر ہنس دی۔

نہیں شمیم یہ بات نہیں۔ آج تو اس قدر بھیڑ تھی کہ میں تھک کر چور ہو گئی۔

جھوٹ! شمیم نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے۔

اچھا یقین نہ ہو تو دیکھ لو۔ عصمت نے میز کا دراز کھول دیا۔

شمیم نے جب آگے جھک کر جھانکا تو دنگ رہ گیا۔ دراز دس، پانچ اور ایک ایک کے نوٹوں سے بھرا پڑا تھا۔

آ گیا یقین؟ عصمت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ آج میں نے صبح سے اب تک

پانچ سو روپے کمائے ہیں کوئی شک ہو تو گن سکتے ہو۔

شک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بڑے لوگوں کی آمدنی ایسے ہی ہوتی ہے۔

عصمت ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

شمیم! خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ میں اگر کسی کو بڑا سمجھتی ہوں تو وہ تم ہو۔ میرا ارادہ تو تھا تمہیں بہت بڑا آدمی دیکھوں گی۔ لیکن تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی نے میری ساری آرزوؤں پر پانی پھیر دیا ہے۔ شمیم! خاص کر تمہیں مجھ پر ایسے طنز کے تیر نہ چھوڑنا چاہئیں۔

شمیم نے اُسے چور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اچھا بھئی غلطی ہو گئی معاف کر دو۔ آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔

عصمت نے مسکراتے ہوئے ہلکے سے اس کے گال پر چپت لگائی۔

شریر کہیں کا۔ میں کون ہوتی ہوں تمہیں معاف کرنے والی۔

شمیم کو اچانک کوئی خیال آیا اور وہ فوراً سلسلہ کلام بدل کر بولا۔

عصمت! آج میں تم سے ایک بے حد سنجیدہ بات کہنے آیا ہوں۔

کہئے۔

شمیم کرسی کھینچ کر اس سے اور قریب ہو گیا۔

کہہ دوں؟

کہئے نا۔

بُرا تو نہ مانو گی؟

پہلے کبھی ایسا ہوا بھی ہے۔

لیکن اس دفعہ بات ہی کچھ ایسی ہے۔

کیسی بھی ہو تم کہو تو سہی۔

شمیم کو کوئی شرارت سوجھی۔ دونوں کہنیاں میز پر جما ئیں۔ چہرہ دونوں ہتھیلیوں میں لیا اور آنکھیں بند کرتے ہوئے۔

اچھا بابا نہیں کہتا۔

عصمت اسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی۔

شمیم بہت خراب عادت ہے یہ دوسروں کو الجھن میں ڈال کر لطف میں تمہیں کیا ملتا ہے۔

شمیم نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔

بضد ہو تو سنو۔

کہو تو۔

میری صلاح ہے تم شادی کر لو۔

عصمت ایک دم پیلی پڑ گئی۔

شمیم نے ایک ہاتھ اس کے شانے پر رکھا اور دوسرے سے اس کا خوبصورت چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔

کس سوچ میں پڑ گئی ہو عصمت! جواب دو نا۔

عصمت نے چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے موٹے موٹے

قطرے تیر رہے تھے۔ شمیم اس کی یہ حالت دیکھ کر بے قرار ہو گیا۔ فوراً اپنے رومال سے اس کے آنسو پونچھ کر درد بھرے لہجے میں کہا۔

عصمت یہ کیا؟

عصمت نے بچوں کے سے انداز سے کہا۔

شمیم میں شادی نہیں کروں گی۔

کیوں؟

اس کے لئے کہ میں نے ایک شرط مقرر کر رکھی ہے۔

شمیم نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔

وہ کیا؟

جب تک تم ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ایک کامیاب ڈاکٹر نہ بنو گے میں شادی نہیں کروں گی۔

نہیں عصمت ایسا نہیں ہو سکتا۔ تمہیں شادی کرنا ہو گی۔

اول ہوں۔ ناممکن۔

لیکن یہ تمہارا اپنے آپ پر سراسر ظلم ہے عصمت!

کچھ بھی میں جو عہد کر چکی ہوں اسے پورا کر کے رہوں گی

شمیم نے کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد کہا۔

اگر میں ایم بی بی ایس نہ کر سکا تو پھر؟

عصمت نے بے تعلیق کہا۔

میں شادی ہی نہ کروں گی۔

شمیم زور سے چلایا

عصمت!

لیکن اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔

یہ میرا آخری فیصلہ ہے شمیم! جسے کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔

کیا میرے کہنے پر بھی یہ ارادہ نہ بدلو گی؟

آپ کی خاطر تو یہ شرط میں نے عائد کی ہے۔ جس طرح آپ نے میرے کہنے پر کالج میں داخلہ نہیں لیا۔ اسی طرح بھی اب آپ کا کہا نہ مانو گی۔

شمیم اٹھ کھڑا ہوا۔

اچھا میں چلتا ہوں۔

عصمت نے فوراً اس کا بازو پکڑ لیا۔

روٹھ گئے کیا؟

شمیم کی آواز شکایت آمیز تھی۔

میں کیوں روٹھنے لگا۔

تو پھر بیٹھ جاؤ نا۔

نہیں چلتا ہوں۔ غسل کر کے تنویر کے ہاں بھی جانا ہے۔ پھر دیر ہو جائے گی۔

چلے جانا ذرا بیٹھو تو۔ چائے بنواتی ہوں۔

نہیں میں نہیں پیوں گا۔

ضد نہ کرو شمیم! بیٹھ جاؤ۔ چائے کا گرم گرم کپ پینے سے دن بھر کی تھکاوٹ دور ہو جائے گی۔ اور اس نے اٹھتے ہوئے شمیم کا دوسرا بازو بھی پکڑ کر زبردستی کرسی پر بٹھا لیا اور اس کے ساتھ ہی فوزیہ کو چائے بنانے کے لئے کہہ ڈالا۔

فوزیہ نے دوائیوں کے مسکچر بنانا چھوڑ دیئے۔ اور سٹوو پر چائے بنانے لگی۔

شمیم اور عصمت پھر اسی طرح ایک دوسرے کے قریب ہو کر بیٹھ گئے۔ لیکن چپ چپ اور اداس۔

تھوڑی دیر بعد فوزیہ چائے کے دو کپ اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ شمیم اور عصمت اس سے کپ لے کر خاموشی سے چائے پینے لگے۔ اچانک عصمت کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔ چائے کی پیالی اپنے نازک لبوں سے جدا کرتے ہوئے شمیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شمیم! میں بھی کتنی بے وقوف ہوں۔ تمہیں ایک بات کہنا تو میں بھول ہی گئی۔

شمیم نے بڑے تجسس سے پوچھا۔

کون سی بات؟

سمیرا آئی تھی۔

کیوں؟

تم سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔

پوچھ لیا ہوتا۔

مجھ سے اس نے کچھ نہیں کہا۔ وہ بہت پریشان اور اداس دکھائی دے

رہی تھی۔

کیوں خیریت تو ہے۔

مجھے اس نے کچھ بتایا ہی نہیں۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ یہاں سے چلی گئی۔ میں نے کریدنے کی بے حد کوشش کی۔ لیکن وہ کچھ اس طرح خاموش رہی جیسے کسی بہت بڑی الجھن میں مبتلا ہو۔

شمیم نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

کوئی پیغام دے گئی ہے کیا؟

ہاں۔ وہ کہہ رہی تھی شمیم جب بھی آئیں تو انہیں کہئے تنویر چچی کے ہاں سے قبل مجھ سے ملیں۔

لیکن وہ کہاں ملے گی؟

تمہارے مکان کی چابی وہ مجھ سے لے گئی ہے۔ وہ وہیں تمہارا انتظار کر رہی ہوگی

شمیم چائے کا آخری گھونٹ جلدی جلدی حلق سے نیچے اتارتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

اچھا عصمت میں چلتا ہوں۔

میکا کار لیتے جاؤ۔

تم کیسے جاؤ گی؟

میں ٹیکسی سے چلی جاؤں گی اور ہاں کھانا آج ہوٹل سے نہ کھانا۔

کیوں؟

امی ہر روز آپ کو یاد کرتی ہیں۔ کار تو آپ کے پاس ہے ہی۔ شام سے قبل وہاں آجائیے۔ اکٹھے کھانا کھائیں گے۔ اور ہاں آج رات رہنا بھی وہیں ہوگا۔

اچھا کوشش کروں گا۔

عصمت کی آواز میں التجا تھی۔

کوشش نہیں شمیم پکا وعدہ کرو۔ آؤ گے نا۔ میں کھانے پر تمہارا انتظار کروں گی۔

اچھا بھئی وعدہ ہوا۔

ضرور آنا۔ بھولنا نہیں

اب تو وعدہ ہوگیا۔ بھولوں گا کیسے۔

شمیم واپس مڑتے ہوتے بڑی تیزی سے باہر نکل گیا۔ اور عصمت کے سرخ سرخ اور نیکھڑیوں کے سے نرم و نازک لبوں پر خوشی میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ پھیل گئی۔

شمیم جب گھر میں داخل ہوا تو سمیرا اس کے کمرے میں کرسی پر بیٹھی کسی گہری سوچ میں غرق تھی شمیم کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور آنکھوں میں افسردگی کی لہر تھی۔

شمیم نے بڑے پیار سے پوچھا۔

کیا بات ہے سمیرا۔ تم اس قدر اداس کیوں ہو؟

سمیرا بڑی بے تابی سے آگے بڑھ کر شمیم سے لپٹتے ہوئے روہانسی آواز میں بولی۔

شمیم!!
شمیم اسے اپنے ساتھ لپٹائے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔
کیا بات ہوئی سمیرا! کچھ بولو تو۔
میں لاہور جا رہی ہوں شمیم!
شمیم نے حیرت سے پوچھا۔
کیوں؟
چچا جان سندھ میں بیمار ہیں۔ تنویر چچی بچوں سمیت ان کے پاس جا رہی ہیں۔ میرے ابا کی تبدیلی گوجرانوالہ ہوگئی ہے۔ اور میں اپنی بڑی خالہ کے لاہور چلی جاؤں گی۔
شمیم پریشان سا ہوگیا۔
پڑھائی ختم کر دو گی کیا؟
نہیں وہیں پڑھوں گی۔
اکیلی جاؤ گی؟
سہیل بھیا بھی ساتھ ہوں گے۔
لاہور رہو گی کہاں؟
گلبرگ۔ وہاں میرے خالو کی عالی شان کوٹھی ہے۔
کیا کام کرتے ہیں وہ؟
بہت بڑے کنٹریکٹر ہیں۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد شمیم کی ڈوبتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔
سمیرا! وہاں جاکر بھول تو نہ جاؤ گی؟
سمیرا کی آنکھیں آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے برسانے لگیں۔
شمیم! یہ بات مجھے کہنا چاہتے تھی۔ میں ... میں بھلا آپ کو بھول سکتی ہوں۔ آپ کی محبت تو میرے رگ و ریشہ میں سما چکی ہے جسے سوائے موت کے کوئی مجھ سے جدا نہیں کر سکتا۔ میں خالو جان سے کہہ کر آپ کے لئے کوئی اچھی سی سروس تلاش کرنے کے بعد آپ کو بھی وہیں بلا لوں گی۔
نہیں سمیرا! اس طرح تم بدنام ہو جاؤ گی۔ مجھے تم صرف عصمت کے توسل سے خط لکھ دیا کرنا میرے لئے یہی سب کچھ ہوگا۔
کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ سمیرا شمیم سے لپٹی رہی اور شمیم نے کچھ دیر خلا میں گھورتے ہوئے پوچھا۔
سمیرا! کب جاؤ گی لاہور؟
چچی جان کل سندھ جا رہی ہیں۔ میں اور بھائی جان بھی ہوں۔ میں اور بھائی جان ان کے ساتھ لاہور تک جائیں گے۔ میں کافی دیر سے بیٹھی ہوئی ہوں۔ میں ابھی اپنا سامان بھی تیار کرنا ہے۔
شمیم اس سے جدا ہوتے ہوئے بولا۔
... تم تھوڑی دیر بیٹھو۔ میں غسل کر کے عصمت کی کار میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں گا۔

سمیرا کرسی پر بیٹھ کر اپنی آنکھیں خشک کرنے لگی۔ شمیم نے غسل کے بعد
تبدیل کیا پھر سمیرا کو ساتھ لے کر باہر آیا اور کار دونوں کو لئے بڑی تیزی سے
گنج کی طرف بڑھنے لگی۔

شمیم نے وہ رات عصمت کے ہاں گزاری۔ اور

اور

دوسرے روز سمیرا اس کی تنہائیوں اور پریشانیوں میں اضافہ کرتی ہ
لاہور چلی گئی۔

کاروان روز و شب اپنی اسی رفتار سے انجانی منزل کی طرف آگے بڑھتا رہا۔
ور سے صفیہ گاہے گاہے شمیم کو خط لکھتی رہتی۔ عالیہ بھی ہفتہ وار عصمت
یغیرہ کے حالات سے مطلع کرتی رہتی۔ اس کے علاوہ عصمت کے توسط سے
کے خطوط بھی لاہور سے شمیم کو ملتے رہتے۔ فیکٹری میں چھٹی کے بعد شمیم کا اب
وقت عصمت کے پاس ہی گزرتا۔ اکثر وہ کئی کئی راتیں بھی اب عصمت اور
کی امی کے پاس ان کی کوٹھی میں گزارنے لگا۔

سردیاں اپنے جوبن پر تھیں۔ عصمت ایک روز اپنے کلینک میں مریضوں
دیکھنے میں بری طرح مصروف تھی کہ ڈاکیے نے اندر داخل ہو کر اس کے
ٹیل تار تھما دیا۔ عصمت نے لرزتے ہاتھوں سے جلدی جلدی کھول کر پڑھنا

شروع کر دیا۔ یک دم اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اور اس کے چہرے پر
اور غم برسنے لگا۔ سب مریضوں کو اس نے چھوڑ دیا اور سٹور روم میں مصروف
فوزیہ کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ وہ اسے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ عصمت
کے پاس پہنچتے ہی اپنی گھبراہٹ پر کسی قدر قابو پاتے ہوئے بولی۔

فوزیہ کلینک بند کر دینا۔ میں جا رہی ہوں۔

فوزیہ اور زیادہ پریشان ہو گئی۔

خدا خیر کرے کیا بات ہو گئی ہے؟

عالیہ کا تار آیا ہے۔

کیا لکھتی ہے؟

صفیہ خالہ کی حالت سخت نازک ہے۔ اس نے مجھے اور شمیم کو بلایا

ابھی جا رہی ہیں کیا؟

ہاں۔ تم کلینک بند کر کے چابی امی جان کو دے آنا۔

کب تک واپس ہو گی؟

کوئی پتہ نہیں کتنے دن وہاں رہنا پڑے۔

فوزیہ خاموش ہو گئی۔ عصمت بڑی تیزی سے باہر نکل گئی۔

چند منٹ بعد وہ اپنی کار میں عابد الیکٹرک فین کمپنی کی عمارت کے
گیٹ کے پاس تھی۔ کار میں بیٹھے بیٹھے ہی اس نے چوکیدار سے شمیم
کے لیے کہا۔ چوکیدار اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر شمیم باہر آیا۔ عصمت کو دیکھ

کے ذہن میں طرح طرح کے تفکرات جنم لینے لگے۔ لیکن وہ سب کو جھٹکتا
آگے بڑھا۔ اور کار کی کھڑکی میں اندر جھانکتے ہوئے پوچھا۔

کیا بات ہے عصمت؟

عصمت نے فکر گیر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

عالیہ کا تار آیا ہے۔

شمیم چکرا کر رہ گیا۔

خیریت تو ہے؟

خالہ جان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔

کہاں ہے تار۔ دکھاؤ مجھے۔

عصمت نے تار اس کی طرف بڑھا دیا۔

شمیم جلدی جلدی تار کھول کر پڑھنے لگا۔ پھر اس کا بدن لرزنے لگا۔
ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ اور وہ کار کے ساتھ ٹیک لگا کر اپنے آپ کو سنبھالنے
کوشش کرنے لگا۔ عصمت فوراً باہر نکلی اور اسے پکڑ کر اگلی نشست پر بٹھا
شمیم کا سر عصمت کے شانے پر تھا۔ اور اس کے پورے بدن کا بوجھ بھی۔
اس کے نرم و گداز بدن پر تھا۔

عصمت نے کار سٹارٹ کی اور واپس موڑ کر پہلے شمیم کے گھر سے اس کے
کپڑے سوٹ لئے پھر اپنے ہاں سے اپنے گرم کپڑے اور کچھ دوسرا ضروری سامان
لے کر اس کے بعد اس کی کار بڑی تیزی سے سینی ٹوریم کے رخ پر آگے بڑھ رہی تھی۔

شمیم اور عصمت جب سینی ٹوریم میں داخل ہوئے تو صفیہ بستر پر بے
پڑی تھی۔ قریب ہی عالیہ کرسی پر بیٹھی تھی۔ شمیم اور عصمت کو دیکھتے ہی وہ
ہوئی۔ اور صفیہ کی طرف کسی قدر پرسکون نگاہوں سے دیکھتے ہوئے۔

خالہ جان! شمیم اور عصمت آ گئے۔

صفیہ نے رفتہ رفتہ آنکھیں کھولیں۔ شمیم کو دیکھتے ہی اس کے لبوں پر
ڈوبی ہوئی پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور آنکھوں میں آنسوؤں کے ریلے
لگے۔ شمیم بھاگ کر آگے بڑھا اور "امی" "امی جان" پکارتا ہوا اس سے لپ
اس کا سر صفیہ کی چھاتی پر رکھا تھا۔ صفیہ کا ایک بازو شمیم کی گردن کے گرد
اور دوسرے ہاتھ سے وہ شمیم کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی اور

اور

اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے قطرے نکل کر رخساروں پر پھیلنے لگے۔
وہ بیٹے سے ملنے کی خوشی کے ساتھ باہر لمحہ بڑھتی ہوئی بیماری کی وجہ سے دور خلا
نظر آتی ہوئی جدائی کی وجہ سے۔

شمیم پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ قریب ہی عصمت بھی بیٹھ گئی۔ صفیہ تھوڑی دیر اپنے
رہی پھر بڑی شفقت آمیز نگاہوں سے شمیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شمیم! بیٹا وہ

صفیہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ شمیم فوراً بولا۔

صفیہ نے شمیم کی طرف بڑی حسرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

بیٹا! اب میں موت کے کنارے کھڑی ہوں۔ زندگی شاید زیادہ دیر تک ساتھ۔
عصمت نے پریشان ہو کر صفیہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

خالہ! خدارا ایسی باتیں نہ کیجیے۔

میں ٹھیک کہہ رہی ہوں بیٹی! سوچتی ہوں شمیم کی خالہ کو خط لکھ دوں تاکہ وہ میرے
پیچھے اسے اپنے ساتھ لے جائے۔

عصمت نے بڑی حیرانگی سے پوچھا۔

تو کیا آپ کی کوئی بہن بھی ہے؟

ہاں بیٹی! میری دو بہنیں تھیں ایک مر چکی ہے اور دوسری زندہ ہے۔

کہاں ہیں وہ؟

لاہور۔

لیکن آپ نے کبھی ان کا ذکر تو نہیں کیا۔

یہ ایک راز ہے عصمت! جسے میں فاش کرنا نہیں چاہتی۔ اب میری زندگی
آخری دن ہیں۔ اب چھپانے کا کیا فائدہ۔ سنو میں تمہیں اپنے پورے حالات بتاتی
ں۔ پھر اس نے خاندان سے جدائی کی سرگزشت کہہ ڈالی۔ شمیم نے حیرت اور خوشی
ملے جلے جذبات سے پوچھا۔

امی! تو کیا میرے کوئی بڑے بھائی بھی ہیں؟

ہاں بیٹا! اس کا نام انجم ہے۔ اور اس نے تمہاری خالہ رفیعہ کے پاس ہی
رشں پائی ہے۔

لیکن آپ تو کہا کرتی تھیں میرا کوئی بھائی نہیں۔

صرف اس راز پر پردہ برقرار رکھنے کے لئے۔

شمیم نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

امی! بھائی جان کیا کرتے ہیں؟

وہ اپنے خالہ زاد بھائی ندیم کے ساتھ ڈاکٹری کورس کے لئے امریکہ گیا ہوا

بس اب واپس ہی آنے والا ہوگا۔

صفیہ نے چند لمحے رکنے کے بعد کہا۔

بیٹا! انجم کچھ شریر اور سخت طبیعت کا ہے۔ میرے بعد تمہیں اسی کے

رہنا ہوگا۔ اس کی زیادتی یا غصہ کو برداشت کرتے ہوئے ہنسی مذاق میں ٹال جایا کر

امی! آپ فکر نہ کیجئے۔ میں انہیں کبھی بھی خفا نہ ہونے دوں گا۔

صفیہ کا چہرہ متبسم ہوگیا۔

شمیم پھر بولا۔

امی! رفیعہ خالہ کو یہاں نہیں بلائیں گی؟

صفیہ تکیہ پر کہنی جماتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

ضرور بلاؤں گی بیٹا میں اسے ابھی خط لکھتی ہوں۔

پھر اس نے عالیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

عالیہ بیٹی! مجھے وہ پیڈ اور قلم تو دے دو۔

عالیہ نے بیڈ سائڈ ٹیبل سے رائٹنگ پیڈ چند لفافے اور قلم اٹھا کر صفیہ کو

پکڑتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے قلم پکڑا اور رک رک کر سانس لیتے ہوئے لکھنے لگی۔

لکھنے کے بعد لفافے پر پتہ لکھا اور دونوں چیزیں اپنے قریب بیٹھے ہوئے شمیم کی

طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

لفافہ بند کر کے پوسٹ کر دینا۔

شمیم نے لفافہ بند کر کے الٹا کرتے ہوئے پتہ پڑھا تو وہ حیرت میں ڈوب

کر رہ گیا۔ چند ثانیے تک وہ کچھ سوچتے ہوئے صفیہ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر ذرا

ہکلاتے ہوئے بولا۔

امی! یہ پتہ کس کا ہے؟

صفیہ اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

تمہاری خالہ رفیعہ کا۔ اور کس کا ہو سکتا ہے۔

شمیم نے لفافہ عصمت کی طرف بڑھا دیا۔ وہ تھوڑی دیر حیرت سے دیکھتی رہی

پھر اس کی چشم آہو کی سی موٹی موٹی آنکھیں متبسم ہوگئیں اور اس نے صفیہ کی طرف

دیکھتے ہوئے کہا۔

خالہ اس پتہ پر تو ہم سمیرا کو خط لکھتے ہیں۔

صفیہ ششدر سی رہ گئی۔

سمیرا لاہور کیسے چلی گئی؟

عصمت کی جگہ اس دفعہ شمیم بولا۔

اس کے ابا کی تبدیلی گوجرانوالہ ہوگئی ہے اب وہ اپنے بھائی کے ساتھ لاہور اپنی

خالہ کے ہاں چلی گئی ہے۔

لیکن رفیعہ سے اس کا کیا تعلق؟

امی! یہی تو میں آپ سے پوچھتا ہوں۔

صفیہ خلاؤں میں گھورتے ہوئے آہستہ آہستہ بڑبڑائی۔

سمیرا؟ لیکن میرے رشتہ داروں میں تو کوئی بھی اس نام کی لڑکی نہیں۔ خیر تمہیں اس کی امی کا نام یاد ہے کیا؟

نہیں امی! سمیرا کی ماں مر چکی ہیں۔

تو پھر اس کے کسی اور رشتہ دار کا نام بتاؤ؟

شمیم نے کچھ سوچ کر کہا۔

اس نے اپنے بڑے بھائی کا نام سہیل اور اس سے دو بڑی بہنوں کا نام رشیدہ اور انسار بتایا تھا اور ہاں امی اس کی ایک چچی بھی ہیں۔ جن کا نام تنویر ہے اور...

صفیہ نے فوراً اس کی بات کاٹ دی۔

بس کرو شمیم بس کرو۔

شمیم نے کسی قدر جستجو سے پوچھا۔

امی کیا سمیرا...

صفیہ فوراً بول اٹھی۔

ہاں، ہاں بیٹا! سمیرا تمہاری چھوٹی خالہ اقشاں کی لڑکی ہے۔ لیکن اس کا

سمیرا تو نہ تھا۔ خیر ہو سکتا ہے بعد میں بدل دیا گیا ہو۔

شمیم اور عصمت کے چہروں پر اس انکشاف سے مسکراہٹ پھیل گئی۔

صفیہ چند لمحوں تک کچھ سوچتے ہوئے پھر بولی۔

شمیم!

جی امی جان۔

سمیرا کے ابا اسٹیشن ماسٹر ہیں نا۔

ہاں امی۔ وہ آج کل گوجرانوالہ میں ہیں۔

بیٹا! وہ تمہارے خالو بھی ہیں اور چچا بھی۔

تو کیا...

اور تنویر تمہاری سگی چچی ہیں۔ تمہارے ابا، تنویر کے شوہر نثار اور سمیرا کے ابا ساجد سگے بھائی تھے۔ تنویر کے دو لڑکے ہیں۔ بڑا لڑکا جمشید سنا ہے آرمی میں کیپٹن ہے۔ اور اس سے چھوٹا مجاہد ابھی پڑھتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی دو لڑکیاں بھی ہیں خورشید اور پروین۔

شمیم نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

امی! ان کی دو اور لڑکیاں بھی ہیں۔ تحمینہ اور نائلہ۔ جنہیں میں پڑھانے جایا کرتا تھا۔

صفیہ خاموش رہی۔ پھر ہاتھ آگے بڑھا کر عصمت سے خط لیتے ہوئے کہا۔

لاؤ بیٹی! میں سمیرا کو پیار بھی لکھ دوں۔

لرزتے ہاتھوں سے اس نے پھر قلم سنبھالا۔ خط میں ایک سطر کا اضافہ کیا اور پھر
شمیم کو تھماتے ہوئے کہا۔
جاؤ بیٹا! پوسٹ کر آؤ۔
شمیم نے خط لے لیا وہیں بیٹھے بیٹھے بند کرنے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور
تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ عصمت اپنی کرسی کھینچ کر صفیہ سے قریب ہو بیٹھ

۱۱

گلبرگ کی ایک عالی شان، بے حد خوب صورت اور آراستہ پیراستہ کوٹھی کے دہن
کی طرح سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں سمیرا ایک بے حد نرم اور گداز صوفے پر اپنی خالہ رفیعہ
کے ساتھ بیٹھی تھی۔ سامنے ایک دوسرے صوفے پر رفیعہ کے شوہر اور سمیرا کے خالو عظیم اور
ان سے تھوڑی دور دائیں طرف ان کی دونوں لڑکیاں رفعت اور شکیلہ بیٹھی ہوئی تھیں
اور جواں سال و قبول صورت ملازمہ نازلی سب کو چائے کا ایک ایک کپ تھما رہی تھی۔
ڈرائنگ روم سے تھوڑی دور ایک دوسرے کمرے میں سمیرا کا بھائی سہیل بڑے انہماک
سے مصروف مطالعہ تھا۔

جنوری کا وہ سرد ترین اتوار تھا۔ سرد اور خشک ہوائیں خزاں رسیدہ اور پتوں
سے بے نیاز درختوں سے ٹکرا کر وحشت انگیز شور کرتی ہوئی ماحول کو جنون خیزی کی حد

تک اداس اور افسردہ بنا رہی تھیں درختوں سے بے جان پتے جب زمین پر گر
تو تیز ہوائیں انہیں تھوڑی دور تک اڑا کر لے جاتیں۔ پھر بڑی بے رحمی سے ان
اِدھر اُدھر منتشر کر دیتیں۔ اور یوں وہ پتے جو کبھی تر و تازہ اور دل پسند شگوفوں کی شکل
میں زینت چمن بن کر نمودار ہوتے۔ شہر کی گلیوں میں لوگوں کے پاؤں تلے مسل اور
دب کر اپنے حسرت ناک انجام کو پہنچ کر ختم ہو جاتے۔

چائے کا دور چل رہا تھا۔

کہ

ڈاکیے نے دروازے پر دستک دی۔

آپ کا تار۔

تار کا نام سن کر سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ فی الفور کوئی بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا
آخر شکیلہ اٹھی پریشان پریشان سی آگے بڑھی۔ مرسلہ پر دستخط کیے اور تار لے کر پھر دالان
مڑی ہی تھی کہ ڈاکیہ اپنا تھیلا ٹٹولتے ہوئے بولا۔

ٹھہریئے! ایک خط اور بھی ہے۔

وہ پھر مڑی۔ ڈاکیہ اسے ایک ہلکے نیلے رنگ کا لفافہ تھماتے ہوئے واپس چلا گیا
اور شکیلہ کمرے میں داخل ہوئی۔

عظیم جو اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہکلاتے ہوئے بولے
کس کا تار ہے بیٹی؟

شکیلہ نے لفافہ کھولتے ہوئے کہا۔

ابھی بتاتی ہوں ابا جان۔

پھر وہ لفافہ کھولنے لگی۔ لیکن رفیعہ بھی کھٹکتے دل کے ساتھ اپنی پریشانی کا اظہار کیے
بغیر نہ رہ سکی۔ اپنی جگہ پر بڑی بے قراری سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

جلدی کر دیتی۔ خدا خیر ہی کرے۔

شکیلہ نے جب تار کھول کر پڑھا تو خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ رفیعہ نے
بڑی بے قراری سے پوچھا۔

اس نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

امی! ندیم اور انجم بھائی اپنا ڈاکٹری کا کورس مکمل کر کے آ رہے ہیں۔

عظیم کے چہرے پر فوراً رونق آ گئی۔

انہی کا تار ہے کیا؟

جی ہاں!

کہاں سے آیا ہے۔؟

کراچی سے۔

رفیعہ خفگی ظاہر کرتے ہوئے بولی۔

عجیب احمق ہیں دونوں۔ امریکہ سے کراچی پہنچ گئے۔ اور ہمیں اطلاع تک نہ دی۔

عظیم پھر بولے۔

یہاں کب پہنچ رہے ہیں؟

شکیلہ نے کاغذ تہہ کرتے ہوئے کہا۔

آج ہی آخری فلائٹ سے۔

کمرے میں خوشگوار سی خاموشی چھا گئی۔ اور سب کے چہروں پر اس خوشخبری کی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ عظیم کچھ سوچنے کے بعد پھر بولے۔

بیٹی! وہ خط کس کا ہے؟

وہ چونک پڑی۔

اف وہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔

دیکھو تو کس کا ہے؟

شکیلہ نے جونہی خط الٹ کر دیکھا۔ پریشان سی ہو کر بولی۔

ابا جان یہ تو سینی ٹوریم سے آیا ہے۔

سینی ٹوریم سے؟ رفیعہ اور رفعت نے حیرت اور پریشانی سے بیک وقت

عظیم بھی تشویش آمیز لہجے میں بولے۔

ہے کس کا؟

نام تو کسی کا نہیں لکھا ہوا۔

کھول کر پڑھو تو سہی کس نے لکھا ہے۔

سمیرا جواب تک خاموش ہی بیٹھی تھی ایک دم چونکتے ہوئے بولی۔

باجی! خط میرے نام کا تو نہیں؟

شکیلہ نے تسلی کے لئے پھر پتہ دیکھا۔ اور بہ نگاہ غائر سمیرا کی طرف دیکھ کر کہا

نہیں! ہے تو ابا جان کے نام کا۔

لفافہ کھول کر وہ خط پڑھنے لگی۔ اس کے چہرے پر پریشانی تجسس اور کچھ خوشی کے ملے جلے جذبات نمودار ہونے لگے۔ اور پھر خط ختم کرنے کے بعد رفیعہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

امی! صفیہ خالہ زندہ ہیں۔ انہیں ٹی بی ہے۔ آپ کو بہت جلد آنے کے لئے لکھا ہے۔

رفعت نے حیرت سے پوچھا۔

صفیہ۔ زندہ ہے؟

میں کوئی جھوٹ کہہ رہی ہوں۔ خود خط پڑھ کر دیکھ لو۔

رفیعہ بیچ میں بول پڑی۔

تیرا دماغ تو نہیں چل گیا۔ وہ بیچاری تو خاندان سے بچھڑ کر نہ جانے کہاں کھو چکی ہے۔

شکیلہ نے خط آگے بڑھا دیا۔

امی یقین نہ ہو تو خود پڑھ لو۔ انہوں نے سمیرا کو پیار بھی لکھا ہے۔

رفیعہ نے حیرانگی سے پوچھا۔

سمیرا کو پیار بھی لکھا ہے۔؟

ہاں ہاں۔ خود دیکھ لیجئے۔

رفیعہ نے خط لے کر جلدی جلدی پڑھا۔ پھر وہ خلاؤں میں گھورنے لگی اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک گئے تھے اس درمیان میں عظیم اس سے خط لے کر پڑھنے لگے۔

رفیعہ جانے کب تک غوطہ زن رہتی لیکن سمیرا کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

خالہ جان! تو کیا صفیہ واقعی ہماری سگی خالہ ہیں؟

رفیعہ جس کی آنکھیں آب گوں ہو گئیں تھیں ذرا افسردگی سے بولی۔

ہاں بیٹی! وہ تمہاری سگی خالہ ہیں۔ اور انجم، شمیم کا بھائی ہے۔ خدا کی قدرت دیکھو ایک بھائی تو ڈاکٹری کا کورس کر کے امریکہ سے آرہا ہے اور دوسرے نے جانے کچھ پڑھا لکھا بھی ہے یا بے چارہ مزدوری کر کے ماں کا پیٹ پالتا رہا ہے۔

سمیرا نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

انجم، شمیم کے بھائی ہیں۔

ہاں بیٹی!

خالہ۔ شمیم بھی ان پڑھ نہیں اس نے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس سے چھوڑ رکھا ہے۔ ابا اسے یہاں لا کر پڑھائیں گے۔ انجم بھائی کی طرح وہ بھی ڈاکٹر بن جائے گا۔ ٹھیک ہے نا خالہ؟

سمیرا کچھ رکی۔ سوچا۔ اور پھر پوری تفصیل سے صفیہ شمیم اور ثمینہ سے ملاقات مزے لے لے کر سنا ڈالی۔

رفیعہ نے ابدیدہ ہو کر پوچھا۔

تو کیا ثمینہ مر گئی؟

ہاں خالہ بڑی پیاری لڑکی تھی وہ۔

ہم بہت بدقسمت ہیں بیٹی! ہم سے تو عصمت ہی اچھی رہی جو پرائی ہو کر بھی اپنوں کی طرح ان کی خدمت کرتی رہی۔

ہاں خالہ! عصمت باجی واقعی بہت بلند کردار ہیں۔

بیٹی! اتنے دن شمیم، ثمینہ اور نائلہ کو پڑھانے آتا رہا۔ تنویر اور تم بھی اس کے ہاں گئیں حیرت ہے پھر بھی تنویر صفیہ کو نہ پہچان سکی۔

نہیں خالہ جان یہ بات نہیں۔ صفیہ خالہ اور تنویر چچی کا کبھی سامنا ہی نہ ہوا تھا۔ عظیم قطع کلام کر کے رفیعہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

اب باتوں ہی باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ صفیہ کی حالت خراب ہے۔ اسے یہاں لانے کے لئے ہمیں اسی وقت روانہ ہونا چاہیئے۔

رفیعہ نے ان کی تائید کی۔

میرا بھی یہی ارادہ ہے لیکن پہلے سہیل کو اطلاع کرنی چاہیے۔

پھر وہ نازلی سے مخاطب ہوئی۔

نازلی! سہیل کہاں ہے؟

نازلی نے بڑے ادب سے جواب دیا۔

جی وہ تو اپنے کمرے میں ہیں۔

کیا کر رہا ہے؟

پڑھ رہے ہیں۔

چائے دی اُسے؟

جی ہاں۔

ذرا جا کر اسے یہاں بلا لاؤ۔

سمیرا فوراً اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

نہیں خالہ اسے رہنے دیجئے میں خود بلاتی ہوں بھائی جان کو۔

نازلی پھر چائے کی ٹرالی کے پاس کھڑی ہو کر کرٹی کوزی کو جھاڑنے لگی۔ سمیرا

اور خط لے کر ڈرائینگ روم سے باہر نکل گئی۔

سہیل اپنے کمرے میں محو مطالعہ تھا کہ سمیرا ہاتھ میں تار اور خط پکڑے اندر داخل

ہوئی بولی۔

بھائی جان! آپ کو ایک خوشخبری سناؤں؟

سہیل نے کتاب سے نگاہیں ہٹائے بغیر کہا۔

ہوں۔

سمیرا نے اس مختصر سے جواب پر خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

آپ تو بات بھی کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ اچھا اگر آپ کو اس خوشخبری

کوئی دلچسپی نہیں ہے تو میں چلی۔ وہ سہیل کو تنگ کرنے کے لئے واپس مڑی۔

سہیل نے کتاب سے نگاہیں اٹھائیں اور سمیرا کے ہاتھ میں خط دیکھ کر کسی

اشتیاق سے پوچھا۔

سمیرا! یہ خط کس کا ہے؟

سمیرا واپس مڑتی ہوئی پھر اس کی طرف بڑھنے لگی۔

بوجھئے کس کا ہے؟

سہیل نے کتاب بند کر دی۔

رشیدہ آپا کا ہوگا۔

نہیں۔

النساء باجی کا؟

بالکل نہیں۔

ابا جان کا؟

اوں ہوں۔

جمشید بھائی کا ہوگا پھر؟

نہیں تو ــــ

تنویر چچی کا؟

یہ بھی غلط۔

بس تو پھر نثار چچا کا ہوگا۔

ان کا بھی نہیں۔

تو پھر ... وہ ... ہاں ... مجاہد کا۔

نہیں مجاہد بھائی کا بھی نہیں۔

بس تو پھر کسی کا بھی نہیں ہے۔ ایسے ہی کہیں سے پرانا خط اٹھا لائی ہو۔

نہیں بھیا! ابھی ابھی آیا ہے۔

بس رہنے دو۔ تم تو ہو ہی جھلی۔ مجھے کیوں پاگل بنانے لگی ہو۔

سچ کہتی ہوں بھائی جان۔ بہت بڑی خوش خبری ہے۔
تو پھر بتا دو نہیں تو میں پڑھنے لگا ہوں۔
بھائی جان وہ شمیم تھے نا؟
کون شمیم؟
وہی جو تحمینہ اور نائلہ کو پڑھانے آیا کرتے تھے۔
ہاں۔ کیا ہوا اُسے؟
اور ان کی امی بھی تھیں جن کا نام صفیہ تھا۔
ہاں ہاں۔ کچھ بولو تو۔
بھائی جان وہ ... وہ ہمارے ...
کیا وہ وہ لگا رکھی ہے۔ صاف صاف کیوں نہیں بتا دیتی۔
بھائی جان وہ ہماری خالہ ہیں۔ اور شمیم ہمارے خالہ زاد ہیں۔
بالکل جھوٹ۔
جھوٹ نہیں ہے بھائی جان! یہی نہیں بلکہ انجم اور شمیم سگے بھائی بھی ہیں
تمہیں کس نے کہا؟
یہ خط پڑھ لیجئے۔ اس نے صفیہ کا خط اسے تھما دیا۔
سہیل خط لے کر جلدی جلدی پڑھنے لگا۔ اس کا چہرہ مسکراہٹ سے کھل اٹھا
تم ٹھیک کہتی ہو سمیرا۔ وہ واقعی ہماری خالہ ہیں۔ میں آج ہی انہیں اور شمیم
کو لینے جاتا ہوں۔

ہاں بھیا خالو بھی یہی کہہ رہے تھے۔
خالہ جان نے خط پڑھا ہے؟
ہاں!
کیا کہہ رہی تھیں؟
آپ کو بلایا ہے۔
ڈرائینگ روم میں۔
ہاں۔
چلو ان کے پاس چلیں۔ جلدی کرو۔
نہیں بھائی جان ٹھہریئے۔ ایک اور خوش خبری بھی ہے۔
سہیل نے اشتیاق سے پوچھا۔
کیا؟
آج آخری فلائٹ سے انجم اور ندیم بھائی بھی آ رہے ہیں۔
سہیل کی خوشی میں ڈوبی ہوئی آواز بلند ہوئی۔
سچ؟
یہ دیکھئے ان کا تار آیا ہے۔
سہیل فوراً تار لے کر پڑھنے لگا۔ پھر خوشی سے بے قابو ہو کر ایک چھلانگ لگے
ماتھا اپنی سے اٹھ کھڑا ہوا۔
بس اب تو مزہ ہی آ جائے گا یہاں رہنے کا۔ میں تو یہاں اکیلے پڑے پڑے بدمزگی

سی محسوس کرنے لگا ہوں۔ اب انجم اور ندیم بھائی ہوں گے۔ اور ان دونوں سے بڑھ کر شمیم جیسی سنجیدہ اور سلجھی ہوئی شخصیت میرے پاس رہے گی۔ چلو سمیرا ڈرائینگ روم میں چلیں۔ میں آج ہی خالہ اور شمیم کو لینے سینی ٹوریم جاؤں گا۔

سہیل اور سمیرا ڈرائینگ روم میں داخل ہوئے۔ سہیل عظیم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

خالو جان! جلدی کیجئے۔ خالہ جان اور شمیم کو لانے کے لئے ابھی چلنا چاہیئے

عظیم بڑی شفقت سے بولا۔

بیٹا! میں تو تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ میں اور تمہاری خالہ صفیہ اور شمیم کو لانے کے لئے جاتے ہیں۔ تم آخری فلائٹ سے انجم اور ندیم کو ائیر پورٹ سے لے آنا۔

سہیل فوراً مچل گیا۔

نہیں خالو جان ایسے نہیں ہو سکتا۔ میں بھی ساتھ چلونگا۔ انجم اور ندیم کو لانے کے لئے رفعت، سکیلہ اور سمیرا چلی جائیں گی۔

چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔ پھر شوکت سے کہو گاڑی نکالے اور ہاں اسے کہنا گاڑی نکالے۔

سہیل فوراً باہر نکل آیا۔ اور برآمدے میں کھڑے ہو کر زور زور سے ڈرائیور کو آواز دینے لگا۔

شوکت! شوکت چچا!!

بوڑھا شوکت اپنی کوٹھڑی سے نکلا۔ بھاگتے ہوئے کوٹھی کا باغیچہ طے کیا اور ان کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

کیا بات ہے بابو جی؟

ذرا گاڑی نکالو جلدی جلدی۔ بڑی کار نکالنا۔

کہیں جائیں گے؟

ہاں ہاں۔

کہاں؟

مری۔

اسی وقت کیا؟

ہاں اسی وقت بلکہ ابھی۔ تم جلدی سے گاڑی نکالو۔

شوکت واپس چلا گیا۔ عظیم، رفیعہ اور سہیل جانے کی تیاری کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد سب باہر آئے۔

عظیم، رفیعہ اور سہیل اپنے مختصر سے سامان کے ساتھ باغیچہ طے کرتے ہوئے کار میں جا بیٹھے۔ رفعت، سکیلہ اور سمیرا ہاتھ ہوا میں لہرانے لگیں۔ پھر کار اسٹارٹ ہو کر ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور کوٹھی سے باہر نکلتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

۱۲

آخری فلائٹ کے آنے میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے۔ سمیرا، رفعت اور شکیلہ بڑی بے چینی سے ایئرپورٹ پر انتظار کر رہی تھیں آخر خدا خدا کر کے جہاز لینڈ ہوا۔ انجم اور ندیم اپنے مختصر سے سامان کے ساتھ مسکراتے ہوئے نمودار ہوئے۔

رفعت اور شکیلہ نے آگے بڑھ کر بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا۔ سمیرا تھوڑی پیچھے ہی رہی۔ انجم کی نگاہ جب اس پر پڑی تو وہ فوراً رفعت کو مخاطب کرتے ہوئے بولا

یہ کون صاحبہ ہیں؟

رفعت نے مسکرا کر کہا۔

آپ نے نہیں پہچانا؟

قطعاً نہیں۔ میرے ذہن میں تو کوئی ایسا جانا پہچانا چہرہ نہیں ابھر رہا۔

اپنی سمیرا ہیں۔

انجم نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

اف۔ اس قدر۔۔۔

انجم کچھ سوچ کر رک گیا۔

لیکن ندیم شرارت آمیز نگاہوں سے سمیرا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

ہاں ہاں کہہ ڈالو نا کہ اس قدر تبدیلی جوان ہونے کے بعد۔

انجم چپ ہی رہا۔ سمیرا شرما سی گئی۔ سب اس طرح ہنسی مذاق اڑاتے ایئرپورٹ سے باہر آئے اور کار سب کو لئے بڑی تیزی سے گلبرگ پہنچ گئی۔

انجم اور ندیم جب کوٹھی میں داخل ہوئے تو دونوں ایک دوسرے کو کچھ پریشان نظروں سے دیکھنے لگے۔ آخر ندیم نے رفعت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔

امی اور ابا جان کہاں ہیں؟

رفعت کی جگہ شکیلہ نے جھٹ جواب دیا۔

بھائی جان وہ مری گئے ہوئے ہیں۔

ندیم نے حیرت سے کہا۔

اس قدر سردی میں وہاں جانے کی کیا ضرورت پڑ گئی۔؟

بھائی جان! صفیہ خالہ کا سراغ مل گیا ہے۔ امی اور ابا سہیل کے ساتھ انہیں لینے

گئے۔

ندیم کی جگہ اس دفعہ انجم پرمسرت لہجے میں بولا۔

آپ لوگوں کو کیسے پتہ چلا۔

شکیلہ نے ذرا افسردگی سے کہا۔

انہیں ٹی بی ہے۔ اور انہوں نے سینی ٹوریم سے ابا جان کو خط لکھا تھا۔

انجم پریشان ہو گیا۔ کچھ رک کر پوچھا۔

کب تک لوٹیں گے؟

ابا جان تو کہہ رہے تھے کل واپس آ جائیں گے۔

آج ہی گئے ہیں کیا؟

ہاں۔ دوپہر سے کچھ قبل گئے ہیں۔

انجم کچھ افسردہ سا نظر آنے لگا۔ رفعت فوراً تاڑ گئی۔ ایک دم موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

پہلے گرم پانی سے غسل کر لیجئے پھر کھانے کے بعد باتیں ہوں گی۔

انجم اور ندیم لباس تبدیل کر کے غسل کو چلے گئے۔ سمیرا، رفعت اور شکیلہ ان کے کمرے درست کرنے لگیں۔

دو دن کچھ انتظار اور پریشانی میں گزر گئے۔ تیسرے روز سب برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ کہ ڈاکیہ تار لے آیا۔ سب کانپ سے گئے۔ ندیم نے لرزتے ہاتھوں سے تار لے کر پڑھا اور اس کے چہرے پر موت کے سائے لہرا گئے۔

رفعت نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔

کیا بات ہے بھائی جان؟

ندیم نے آبدیدہ ہو کر کہا۔

خالہ فوت ہو گئیں۔ امی اور ابا پرسوں لوٹیں گے۔ کل تک خاندان کے سب لوگ یہاں پہنچ جائیں گے۔ ابا جان نے سب کو خالہ کی موت سے مطلع کر دیا ہے۔ یہ سنسناتی ہوئی گولی کی طرح یہ خبر سب کے کانوں سے ٹکرائی۔ رفعت اور شکیلہ رونے لگیں۔ انجم کی آنکھوں میں بھی پانی آ گیا۔ اور سمیرا جو

سنتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی یہ خبر سنتے ہی غش کھا کر فرش پر گر گئی۔

اور شکیلہ رونا بھول گئیں۔ اور سمیرا کو اٹھا کر اندر لے گئیں۔

دوسرے روز اس کی طبیعت کچھ سنبھلی۔ خاندان کے سب افراد آنے شروع ہو گئے۔ پھوپھی جب اپنے شوہر نثار اور تحمینہ و نائلہ کے ساتھ آئی تو سمیرا اس سے لپٹ کر زار زار کر رونے لگی۔ تنویر کے بڑے لڑکے کیپٹن جمشید اور سمیرا کے ابا ساجد پہلے آ چکے تھے ان کے ساتھ دونوں بڑی لڑکیاں خور شید، پروین اور چھوٹا لڑکا مجاہد سمیرا نے فوراً پوچھ لیا۔

جان! خور شید اور پروین کیوں نہیں آئیں؟

نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

پروین سخت بیمار ہے۔ میں خور شید اور مجاہد دونوں کو اس کے پاس چھوڑ آیا۔ میں انہیں ضرور ساتھ لاتی لیکن پروین سفر کرنے کے قابل نہیں۔

سمیرا خاموش ہو گئی۔

شام تک خاندان کے سب افراد پہنچ گئے۔ اور عظیم کا گھر جہاں انجم اور ندا
کی خوشی میں محفل رنگ و بو جمنی چاہیے تھی۔ صفیہ کی موت پر ماتم کدہ بن کر رہ گیا
تنویر کا بستر سمیرا کے کمرے میں لگایا گیا۔ تحمینہ اور نائلہ بھی وہیں آ گئیں
طرح ان کی موجودگی میں سمیرا ساری رات رونے کے بجائے کچھ کچھ باتوں
کافی رات گئے تک دونوں سب کے ساتھ ڈرائینگ روم میں بیٹھی رہیں پھر
کمرے میں آ گئیں۔ باہر تیز ہوائیں سائیں سائیں کرتی ہوئیں سردی میں بے
کر رہی تھیں۔

تنویر آتش دان کے قریب بیٹھ کر آگ تیز کرنے کے لئے اور لکڑیاں
لگی۔ سمیرا بھی اس کے پاس بیٹھ گئی۔ تحمینہ اور نائلہ اپنے بستر میں دبکیں خرا
رہی تھیں۔ دونوں چند منٹ تک گہری خاموشی میں غوطہ زن رہیں آخر تنو
بچار کے بعد بولی۔

سمیرا۔

سمیرا جو نہ جانے کن خیالوں میں بھٹک رہی تھی چونک کر بولی۔

جی چچی جان۔

عظیم بھیا کل شمیم کو لے آئیں گے نا؟

تار میں تو یہی لکھا تھا۔ کیوں آپ جلدی واپس جانا چاہتی ہیں کیا

نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔

میں نے سوچا ہو سکتا ہے پروین کی بیماری کی وجہ سے جلدی وا

چاہیں۔

نہیں میرا مطلب اور تھا۔ پروین کے پاس خورشید اور مجاہد تو ہیں اور اس کی
بیماری اب اتنی خطرناک بھی نہیں بس صرف کمزوری ہی باقی رہ گئی ہے۔ میں کہنا چاہتی
تھی کہ شمیم کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔

کہاں؟

سندھ۔

نہیں چچی انہیں یہیں رہنے دیجئے۔

کیوں؟

وہاں آپ کے نزدیک کوئی میڈیکل کالج نہیں ہے یہاں وہ کالج میں داخلہ
لے کر ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کر لیں گے اور اس طرح ان کا مستقبل بھی ندیم اور انجم
بھائی سے کسی طرح کم نہ ہو۔ وہ ذہین ہیں۔ ویسے بھی قابل اور سلجھے ہوئے ہیں۔
خدا نے چاہا تو وہ ایک کامیاب ڈاکٹر ثابت ہوں گے۔

تنویر نے ذرا سوچتے ہوئے پوچھا۔

رفیعہ سے اس سلسلہ میں بات کی تم نے؟

ہاں خان بھی کہہ رہی تھیں کہ شمیم کو کالج داخل کرائیں گے۔

تنویر نے کنکھیوں سے سمیرا کی طرف دیکھ کر کسی بات کی گہرائی تک پہنچنے کی
کوشش کرتے ہوئے کہا۔

تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟

روانی کلام کی وجہ سے سمیرا کے منہ سے بلا سوچے سمجھے نکل گیا۔

رہنے دیجئے چچی انہیں یہیں اس طرح میرا دل..... کچھ سوچ کر وہ رک گئی

تنویر مسکرا پڑی۔

تم فکر نہ کرو بیٹی۔ مجھے تمہارے جذبات اور احساسات کا خیال ہے۔ شمیم تمہارے پاس ہی رہے گا۔ میں تم دونوں کو کبھی جدا نہ ہونے دوں گی۔

تنویر کی بات سے سمیرا شرم و حیا کے باعث پسینوں میں ڈوب گئی۔ اسے اُمید بھی نہ تھی کہ آہستہ آہستہ بھڑک کر شعلے کی شکل اختیار کرتی ہوئی یہ محبت جنگل کی آگ بن کر فاش ہو جائے گی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور منہ دوسری طرف پھیر کر تنویر سے اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے لگی۔

لیکن تنویر سب کچھ سمجھ چکی تھی۔ سمیرا کی بدلتی ہوئی حالت دیکھ کر اس نے فوراً رخِ سخن بدل ڈالا۔

سمیرا! شمیم اتنے اونچے ماحول کا عادی نہیں۔ ہو سکتا ہے۔ یہاں رہ کر وہ اجنبیت سی محسوس کرنے تم اس کا خیال رکھنا۔

سمیرا کو بھر بولنا پڑا۔

آپ فکر نہ کریں چچی۔ میں انہیں ایسا محسوس نہ ہونے دوں گی۔

اور ہاں اپنے لئے یا شمیم کے لئے جتنے بھی روپوں کی ضرورت ہو مجھے لکھ دیا کرنا۔ میں منی آرڈر کر دیا کروں گی۔

نہیں چچی ابا جان ہر ماہ ایک معقول رقم بھیج دیا کرتے ہیں۔ ہاں اگر کبھی کوئی ناگہانی

ضرورت ہوئی تو آپ کو خط لکھ دیا کروں گی۔

کچھ دیر پھر خاموشی رہی۔ آخر تنویر نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

سمیرا سونا چاہیے۔ بارہ بج چکے ہیں۔ اس نے اپنی کلائی گھڑی دیکھ کر کہا۔ اُٹھ کھڑی ہو گئی تنویر بھی اٹھی اور دونوں اپنے اپنے بستر میں دبک گئیں۔

دوسرے روز دوپہر سے کچھ قبل عظیم، شمیم کو لئے واپس لوٹے۔ وہ خود ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر تھے اور پیچھے سہیل اور رفیعہ کے درمیان شمیم بیٹھا تھا۔ کار کوٹھی میں داخل ہوئی گھر کے سب افراد اور باہر سے آئے ہوئے سب لوگ کوٹھی کے صحن میں آ گئے۔ سب سے آگے آگے سمیرا کے ابا ساجد اور تنویر کے شوہر نثار دونوں بھائی تھے۔ ان سے پیچھے سمیرا اور تنویر کے بڑے لڑکے جمشید اور پھر ان کے پیچھے باقی سب لوگوں کا گٹھ جوڑ تھا۔

کار صحن کے درمیان میں رکی۔ پہلے عظیم نیچے اترے پھر رفیعہ اور سہیل بھی اتر گئے لیکن شمیم ابھی تک اندر ہی بیٹھا تھا۔ وہ ایک قیمتی سوٹ اور افسر دے سے موڈ میں بے حد خوب صورت دکھائی دے رہا تھا۔ سہیل پھر واپس مڑا اور شمیم کا بازو پکڑ کر نیچے اتارتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔

اترو نا بھیا نیچے۔

شمیم جب کار سے نیچے اترا اس کی نگاہ سمیرا پر پڑی۔ دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں۔

سمیرا اس موقعہ پر بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن دوسرے مانع ہوئے۔ اس کا جی چاہا بھاگ کر اپنی محبت کے اس مرکز سے لپٹ جائے اور

اس کے سارے غم چھین کر اپنے دامن میں سمیٹ لے۔ لیکن ایسا کیوں کر ممکن ہوتا
لوگوں کی موجودگی میں اظہارِ محبت اور بدنامی کا خیال کس قدر بھیانک اور پرخوف تھا
کہنے کے لئے اس کے لب پھڑپھڑائے بھی لیکن خاموش ہی رہی۔ اور شمیم کو
دیکھ کر وہ تڑپ سی گئی۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ بال بے ترتیب
اور گرد آلود۔ چہرے سے دنیا بھر کی اداسیوں اور غموں کی تراوش اور چال بھی لڑکھڑاتی
خوردہ تھی سمیرا چپکا سی گئی لیکن دل بے تاب کو سنبھالنا ہی پڑا۔

شمیم جب کار سے نیچے اتر کر چند قدم آگے بڑھا سمیرا کے ابا ساجد نے آگے بڑھ
کر اسے اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ اور بڑی شفقت سے پیار کرنے لگے۔ اس کے بعد
نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے قریب ہی
انجم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بیٹا یہ ہے تمہارا بھائی انجم۔

دونوں بھائی ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ لیکن نہ جانے انجم کے ملنے میں
گرم جوشی اور محبت کیوں نہ تھی۔ جو ایک بھائی میں دوسرے بھائی کو ملتے وقت ہوا
ہے۔ حالانکہ شمیم ان چیزوں کا مکمل اظہار کر رہا تھا۔ انجم کی طرف سے بھی کچھ دلوا نہ تھا
لیکن تمام سا جانے اس میں دونوں بھائیوں کے اتنے عرصے کے بعد ملنے کی
حائل تھی۔ یا

یا

پھر انجم ہی سرد مہر تھا۔

شمیم جب انجم سے جدا ہوا تو سمیرا اس سے لپٹ گئی یہ منظر واقعی درست خیز تھا۔ تو سمیرا
پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اور شمیم بھی سسکیاں لینے لگا۔ جونہی وہ پیچھے ہٹا چکرا
سا گیا۔ بعید نہ تھا کہ وہ گر جاتا۔ لیکن فوراً کار کے انجن پر جھک سا گیا۔ اور فضا میں اس
کی ہچکیاں بلند ہونے لگیں۔

ساجد آگے بڑھے اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

صبر کرو بیٹا! ہائیں کسی کا سدا ساتھ تھوڑا ہی دیتی ہیں۔

شمیم کی ہچکیاں اسی طرح بلند ہوتی رہیں۔ سمیرا کا دل اس منظر سے پھٹا جا رہا تھا
سہیل اور جمشید آگے بڑھے اور شمیم کو اپنے بازوؤں کا سہارا دے کر اندر لے گئے۔
سب لوگ اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔

۱۳

شمیم کالج میں داخلہ لے چکا تھا۔ سہیل بی اے کرنے کے بعد آرمی میں لفٹیننٹ ہوگیا۔ اور تنویر کا چھوٹا لڑکا مجاہد ائر فورس میں پائلٹ۔ سمیرا اب ایم اے میں داخلہ لے چکی تھی۔ شمیم کچھ عرصہ اس نئے ماحول میں اجنبیت سی محسوس کرتا رہا۔ لیکن عظیم اور رفیعہ کی بے پناہ محبت سے وہ جلد ہی گھر کے سب افراد میں گھل مل سا گیا۔ بہتر خوراک اچھی رہائش اور ہر چیز کے غم سے بے نیازی نے اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ اس کے بھرے بھرے عارض جہاں کبھی اداسیاں کھیلتی تھیں اب سرخ سیب کی طرح دمک اٹھے تھے۔

اور سب سے بڑھ کر اس کی محبت اس کے پاس تھی جو ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتی۔ سمیرا ہر وقت اس کی آسائش اور خوراک کا خیال رکھتی۔ جیسے

اس کا سب سے بڑا فریضہ ہی یہی ہو۔ خود اس کے کمرے کی صفائی کرتی۔ حالانکہ گھر میں ایک چھوڑ دو ملازمہ تھیں۔ اس کی کتابوں کو ترتیب سے رکھتی۔ کپڑوں کی الماری کی جھاڑ پھونک کرتی۔ اور خود اپنے ہاتھوں سے اس کا لباس تبدیل کراتی۔

سمیرا کے ان کاموں پر سوائے ندیم کے کسی کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ سمیرا کو شمیم کے کام کرتے دیکھ کر جل ہی تو جاتا۔ شاید

شاید ....

وہ سمیرا کے حسن سے متاثر ہو کر شمیم کا رقیب بن بیٹھا تھا۔ اور اس کی جگہ خود سمیرا کا قرب چاہتا تھا۔ کچھ بھی ہو وہ سمیرا کو شمیم کے کاموں میں دیکھ کر برا ضرور مانتا تھا۔

عظیم ایک روز کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے رفیعہ ڈرائینگ روم میں بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے ایک صوفے پر انجم اور ندیم اور دوسرے پر رفعت اور شکیلہ بیٹھی تھیں۔ کمرے کے وسط میں نازلی چائے کی ٹرالی کے پاس کھڑی سب کو چائے دے رہی تھی۔ رفیعہ چائے کا ایک ہلکا سا گھونٹ لیتے ہوئے نازلی کی طرف دیکھ کر بولی۔

نازلی! شمیم کہاں ہے؟

جی وہ باہر پلاٹ میں لیٹے پڑھ رہے ہیں۔

سمیرا بھی وہیں ہے؟

جی ہاں۔

ان کی چائے وہیں پہنچا دینا۔

جی بہت اچھا۔

رفیعہ کچھ دیر رک کر بولی۔

بہت محنت کر رہا ہے میرا بیٹا۔ خدا نے چاہا تو امتحان میں نام پیدا کرے گا

ندیم نے طنز کا تیر چھوڑا۔

مجھے اُمید نہیں کہ وہ پاس بھی ہو۔

رفیعہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

کیوں۔؟

ہر وقت عورتوں میں بیٹھا رہتا ہے۔ میں تو اسے کبھی پڑھتے دیکھتا نہیں۔

بالکل جھوٹ، رات کے دو دو بجے تک پڑھتا رہتا ہے۔ بے چارہ۔ دن کو

بھی آرام نہیں کرتا۔ ہر وقت کتاب پر نگاہیں جمائے رہتا ہے۔

سب آپ کا وہم اور محبت کی زیادتی ہے۔

کیوں نہ ہو محبت تو مجھے ہے ہی اس سے

ندیم مسکراتے ہوئے بولا۔

کیا ہم سے نہیں؟

ہے لیکن اس کی بات کچھ اور ہے۔

کیوں؟

رفیعہ بھی ہنسی مزاح کے موڈ میں تھی۔

اس پاس کھڑے ہو کر دیکھ لینا کبھی۔

تو کیا وہ ہم دونوں سے خوب صورت ہے؟

ضرور وہ ایک چمکتا ہوا چاند ہے جو ہر وقت اپنے حسن کی ضیا پاشی کرتا رہتا ہے

اور تم دونوں اس کے سامنے مدھم مدھم اور اداس اداس سے دو ستارے۔

ندیم نے اپنی کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

اچھا تو ہماری امی جان کے یہ خیالات ہیں ہمارے لئے۔

رفیعہ مسکرانے لگی۔

مجھے تو تم تینوں ایک جیسے ہو۔

پھر اس کے ساتھ محبت کی زیادتی کیسی۔

اس لئے کہ اس میں کچھ وصف بھی زیادہ ہیں۔

ندیم نے بڑے تجسس سے پوچھا۔

مثلاً ہم بھی سنیں۔

رفیعہ نے بے ساختگی سے کہا۔

یہ کہ تم دونوں جو منہ میں آتا ہے کہہ ڈالتے ہو۔ باتونی ہونے میں تم دونوں کا جواب

نہیں۔ نہ سوچنا نہ سمجھنا بس زٹل ہانکتے رہے خواہ اس بیہودہ گوئی کا کوئی برا مانے یا خوش

ہو تمہیں کوئی احساس نہیں۔ اس کے علاوہ تم دونوں کچھ تند خو اور بے مہر بھی ثابت ہوئے

ہو میری باتوں پر اگر یقین نہ ہو تو اپنی ان دونوں بہنوں سے پوچھ لینا۔ رفیعہ نے سکینہ

اور رفعت کی طرف اشارہ کیا۔

ندیم نے خجالت محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

اور وہ صاحب۔

وہ نہایت زیرک، حلیم، سلیقہ مند اور نکتہ رس ہے۔ کبھی بھی کوئی نیا مرحلہ [illegible] چھیڑتا۔ کم گو ہے۔ جو بھی بات منہ سے نکالتا ہے، سچی تلی ہوتی ہے۔ کسی کے خلاف [illegible] کچھ نہیں کہتا۔ اس کے خلاف اگر کوئی زبان درازی کرتا ہے تو نہایت صبر سے کام لیتے [illegible] برداشت کر جاتا ہے۔ اور یہی عقلمند ہونے کی علامت ہے۔ اس کے علاوہ سنجیدہ [illegible] الفہم اور سلجھا ہوا ہے پھر گو تم دونوں اس سے عمر میں بڑے ہو۔ لیکن زندگی کے میدان میں اس کا تجربہ تم دونوں سے وسیع ہے۔ بیمار ماں کی خدمت کرتے کرتے اس میں ایک بالغ نظری پیدا ہو گئی ہے جس سے تم دونوں عاری ہو۔ اور سب سے بڑھ کر وہ تم دونوں سے ردوار بھی ہے

ندیم کان پکڑتے ہوئے بولا۔

توبہ ہے آپ تو زمین آسمان کو ملانے لگیں۔

رفیعہ نے ایک عزم سے کہا۔

کیوں نہ ملاؤں شمیم ہے ہی ایسا۔

ندیم خفگی اور بدمزگی محسوس کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

بُرے تو ہم ہی رہ گئے ہیں ایک۔ پھر وہ ڈرائینگ روم سے باہر نکل گیا۔

انجم، رفعت اور شکیلہ مسکرانے لگے۔ رفیعہ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

ندیم برآمدہ عبور کرنے کے بعد کوٹھی کے باغیچے میں سے گزرتا ہوا جب ایک ہری

بھری گھاس کے پلاٹ کے پاس پہنچا تو کچھ ٹھٹک سا گیا۔ شمیم اور سمیرا ایک دوسرے سے بالکل قریب گھاس پر لیٹے ہر چیز سے بے نیاز اپنی پڑھائی میں منہمک تھے۔ ندیم ایک پودے کی اوٹ میں ہو کر دونوں کو دیکھنے لگا۔ جلد ہی سمیرا کی مترنم آواز فضا کو چیرتی ہوئی ندیم کے کانوں سے ٹکرائی۔

شمیم!

شمیم نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

ہوں۔

سمیرا نے اپنی کتاب بند کر دی۔

چلو اندر چلیں۔

کیوں؟

چائے پئیں چل کر ٹائم ہو گیا ہے۔

یہیں لے آئے گی نازلی۔

اسے کیا پتہ ہم یہاں ہیں۔

وہ پہلے ایک دفعہ دیکھ کر گئی ہے۔

اچھا تو پھر کتاب بند کیجئے۔

کیوں؟

تھوڑی دیر آرام کریں۔

ابھی پڑھا ہی کیا ہے۔

صبح سے تو پڑھ رہے ہیں۔ زیادہ محنت نہ کیا کریں۔ صحت خراب ہو جائے گی۔
نہیں ہوتی۔
سمیرا نے فوراً اس کی کتاب پر ہاتھ رکھ دیا۔
تھوڑی دیر آرام بھی کیجئے۔ سر چکرانے لگتا ہے۔
شمیم نے کتاب بند کر دی۔
اچھا یہ لو۔ اب یہاں بیٹھ کر مکھیاں ماروں کیا؟
نہیں آنکھیں بند کر کے ذہن کو تھوڑا سکون دیجئے۔
ندیم دونوں کی باتیں سن کر جل اُٹھا۔ اور وہیں کھڑا کھڑا بڑی حسرت سے دونوں کو دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد نازلی چائے کی ٹرالی وہیں لے آئی۔ اور شمیم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
شمیم بالو چائے پیجئے۔
شمیم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سمیرا بھی اپنا لباس درست کرتی ہوئی بیٹھ گئی۔ نازلی دونوں کو چائے پلانے لگی۔
تھوڑی دیر بڑی خاموشی سے چائے کا دور چلتا رہا۔ نازلی نے دونوں سے پیالیاں لے کر ٹرالی میں رکھ لیں پھر ایک نیلے رنگ کا لفافہ اٹھا کر لفافہ اٹھا کر شمیم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
شمیم بالو! آپ کا خط۔
شمیم نے لپک کر اس سے لفافہ لیا۔ اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔

چائے سے پہلے کیوں نہ دے دیا۔
اس طرح آپ خط پڑھنے لگنے اور چائے ٹھنڈی ہو جاتی۔
شمیم نے تحسین آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
بہت عقلمند ہو نازلی۔
نازلی مسکرانے لگی۔
شمیم نے کچھ سوچنے کے بعد پھر کہا۔
نازلی ایک بات کہوں؟
کہیے۔
تم مجھے شمیم بالو کہہ کیوں پکارتی ہو؟
نازلی پریشان ہو گئی۔
تو پھر کیسے بلایا کروں؟
میں تمہیں ایک ایسا لفظ بتاتا ہوں جس سے ہم دونوں کے درمیان ایک رشتہ سا ہو جائے گا۔ اور اس سے کچھ تکلف کی مصنوعی دیواریں بھی ختم ہو جائیں گی۔
نازلی نے اپنا سر جھکا لیا۔
سمیرا بھی پریشان ہو گئی کہ شمیم نہ جانے کیا کہنے والا ہے۔ دوسری طرف پودے کے پیچھے چھپے ہوئے ندیم کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔
شمیم نے بلا توقف کہا۔
آئندہ تم مجھے شمیم بھائی کہہ کر پکارا کرو۔

سمیرا مسکرانے لگی۔ نازلی بے حد خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

یہ تو میری خوش بختی ہے کہ مجھے آپ جیسا بھائی مل جائے گا۔ اگر آپ کی یہی رضا ہے تو آئندہ میں آپ کو انہی الفاظ سے پکارا کروں گی۔

ہاں ہاں ضرور مجھے بے حد خوشی ہوگی۔

نازلی دل میں شمیم کے لئے ایک نیا جذبہ اور مضبوط رشتہ لئے مسکراتی ہوئی ٹرالی لے کر واپس چلی گئی۔

شمیم خط کھول کر پڑھنے لگا اس دوران سمیرا بڑے پیار سے ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتی رہی۔ ندیم بھی ابھی تک ویسے ہی کھڑا تھا۔ جونہی شمیم نے خط سے نگاہیں ہٹائیں سمیرا نے پوچھا۔

کس کا خط ہے؟

شمیم ٹال گیا۔

کسی کا نہیں۔

یہ کیا مہمل جواب ہوا۔

آخر خط آیا ہے کسی کا تو ہوگا ہی۔

ایسے ہی ایک آدمی کا ہے۔

سمیرا نے اسے تیز نگاہوں سے دیکھا۔

ایسے ویسے کسی آدمی کا تو نہیں۔ ضرور کسی خاص آدمی کا ہے۔

کیسے اندازہ لگایا تم نے؟

آپ کے چہرے کی مسکراہٹ بتا رہی ہے۔

تو اس کا مطلب ہے مسکرانا بھی چھوڑ دوں۔

اچھا زیادہ باتیں نہ بنائیے۔ بتائیے کس کا ہے؟

عصمت کا۔

کیا لکھتی ہیں؟

کچھ بھی نہیں۔

نہیں بتائیں گے؟

کوئی دھونس ہے کیا؟

سمیرا نے تن کر کہا۔

ہاں۔

شمیم کو بھی شرارت سوجھی۔

چلئے نہیں بتاتا۔

سمیرا اپنی کتابیں لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور افسردہ سی ہو کر بولی۔

ٹھیک ہے نہ بتائیے آپ کی مرضی۔

جونہی وہ جانے کے لئے دو قدم آگے بڑھی شمیم نے فوراً اس کی تنگ موری کی شلوار کا پائنچہ پکڑ کر کھینچ لیا۔ سمیرا کا ایک پاؤں ہوا میں معلق ہو گیا۔ دوسرے پر وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی اور شمیم کی گود میں آ رہی۔ شمیم نے فوراً اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

سمیرا کسمساتی ہوئی بولی۔

چھوڑیئے مجھے۔

شمیم نے اپنی گرفت اور مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

نہیں چھوڑتا۔ یہ لو پڑھو خط۔ شمیم نے عصمت کا خط اس کی طرف بڑھا دیا۔

سمیرا کی نگاہیں متبسم ہو گئیں۔

جانے دیا ہوتا نا۔ کیوں پکڑا پھر۔

شمیم مسکرا پڑا۔

بس دل نے مجبور کر دیا۔

ہوں بڑے آئے دل والے۔

وہ تو پہلے ہی تمہارے پاس ہے۔

سمیرا نے اس دفعہ بڑے پیار سے کہا۔

اچھا چھوڑیئے نا خط تو پڑھنے دیں۔ آپ تو ہر وقت لپٹنے لپٹانے کے موڈ میں رہتے ہیں۔

شمیم نے گرفت ڈھیلی کر دی۔ سمیرا فوراً علیحدہ ہو گئی۔

پودے کی اوٹ میں کھڑے ندیم نے جو یہ منظر دیکھا تو جل اٹھا اور دل پر ہاتھ رکھے آگے نکل گیا۔ سمیرا شمیم کے قریب ہی بیٹھ کر خاموشی سے خط پڑھنے لگی۔

۱۴

شمیم کی دن رات کی محنت آخر رنگ لائی اور وہ پوری یونیورسٹی میں اوّل رہتے ہوئے ایم بی بی ایس پاس کر گیا۔ پورے خاندان کے افراد کی طرف سے مبارک بادی کے خطوط اور تحفے تحائف کا تانتا بندھ گیا۔ سمیرا کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا وہ شمیم کو محبت کے جس ساحل پر دیکھنا پسند کرتی تھی آج وہ اسی ساحل پر کھڑا مسکراتا ہوا پکار رہا تھا۔ رفیعہ نے اپنی بہن کے جگر گوشے کی اس کامیابی پر پانی کی طرح روپیہ بہا ڈالا۔

نتیجے کے روز گھر کے سب افراد کافی رات بیت جانے تک شمیم کے کمرے میں بیٹھے رہے۔ سمیرا اپنے کمرے میں بڑی بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہلتی ہوئی ان کے اٹھنے کا انتظار کر رہی تھی۔ جب سب اٹھ کر سونے کے لئے چلے گئے تو سمیرا ہاتھ میں

ایک رنگ دار کاغذ میں لپٹا ہوا پیکٹ لئے دبے پاؤں شمیم کے کمرے میں داخل ہوا
دو، تین قدم اندر بڑھنے کے بعد رکی اور پھر بڑے پیار سے کہا۔
ڈاکٹر صاحب! میں اندر آسکتی ہوں؟
شمیم جو سونے کی تیاری کر رہا تھا سمیرا کی آواز سن کر چونکا اور پھر اس کی طرف
دیکھتے ہوئے کہا۔
آؤ سمیرا۔
سمیرا خاموشی سے آگے بڑھنے لگی۔
شمیم پھر بولا۔
سمیرا مجھے تم سے ایسے الفاظ کی اُمید نہ تھی۔
سمیرا نے ہاتھ میں پکڑا ہوا پیکٹ شمیم کے پلنگ پر رکھتے ہوئے کہا۔
اس میں کون سی قباحت ہے۔ سچ کہتی ہوں آپ کو ڈاکٹر پکارتے ہوئے مجھے
بڑی خوشی ہوتی ہے۔
میں نے اس لفظ کے خلاف تھوڑا ہی احتجاج کیا ہے۔
تو پھر؟
تمہیں مجھ سے پوچھ کر اندر آنے کی کیا ضرورت تھی۔
اوہ۔ اب سمجھی۔ اچھا غلطی ہوئی معاف کر دیجئے۔
شمیم خاموش رہا۔
سمیرا نے پھر کہا۔

کہتے نا معاف کیا۔
شمیم ہنس دیا۔
سمیرا نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔
چلئے شکر ہے آپ نے معاف تو کیا۔
شمیم نے اس دفعہ پلنگ پر پڑے ہوئے پیکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
پوچھا۔
یہ کیا ہے؟
سمیرا نے شوخ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
بوجھ لیجئے کیا ہے؟
مجھے کیا معلوم۔
نہیں پتہ تو اپنے دل سے پوچھئے۔
شمیم نے شرارتاً کہا۔
"ابھی اس معاملے میں خاموش ہے۔
سمیرا خاموشی سے پیکٹ کھولنے لگی۔ شمیم کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ ایک بیحد
قیمتی سوٹ تھا۔
سمیرا سوٹ شمیم کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔
آپ کے پاس ہونے کی خوشی میں۔
شمیم نے سوٹ لیکر میز پر رکھ دیا اس کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ اور رک رک کر

کہا۔

سمیرا! یہ سب تمہاری وجہ سے ہے کہ میں آج اس مقام پر پہنچ گیا ہوں۔

سمیرا کی سرمگیں آنکھیں میں بھی آنسو آ گئے۔

یوں نہ کہیئے۔ میں نے آپ کے لئے کیا کیا ہے۔ یہ سب آپ کی محنت کا پھل ہے کہ خدا نے آپ کی بھولی بھٹکی منزل سے آپ کے سامنے لا کھڑی کی ہے۔

الفاظ کے ساتھ ہی سمیرا نے اپنی انگیا میں ہاتھ ڈال کر ایک سنہری رنگ کی ڈبیا نکالی اور پھر اس میں سے سونے کی ایک خوب صورت انگوٹھی نکال کر شمیم کے ہاتھ میں پہنانے لگی۔

شمیم نے چونک کر کہا۔

سمیرا! یہ کیا۔ مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو۔

سمیرا نے کرب انگیز لہجے میں کہا۔

کیا آپ مجھے اپنے آپ سے جدا سمجھتے ہیں؟

نہیں۔ تمہارے بغیر تو میں زندگی کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ تم ... تم تو میری زندگی کی حسین منزل ہو جس کی خاطر میں ہر غم سے ٹکراتے ہوئے صرف تمہیں پانے کے لئے آگے بڑھ رہا ہوں۔

تو پھر آپ نے کیوں کہا۔ مجھ پر بوجھ نہ ڈالو۔

بس تیز کلامی میں منہ سے نکل گیا۔ ویسے بھی انسان خطا کا پتلا تو ہے ہی۔

سمیرا نے شوخ اور متبسم نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

اچھا آپ آرام کیجیئے میں چلی۔

لیکن دروازے کی طرف چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ واپس مڑ کر پھر بولی۔

ایک بات تو پوچھنا بھول ہی گئی۔

کیا؟ شمیم نے سمیرا کا دیا ہوا سوٹ اپنے کپڑوں کی الماری میں رکھتے ہوئے کہا۔

آپ پاس ہونے کی خوشی میں مجھے کیا دیں گے؟

جو مانگو گی۔

نہیں ایسے نہیں۔

تو پھر؟

آپ اپنی مرضی سے کچھ دے ڈالیے۔

میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا تم جو بھی منہ سے نکالو گی لا دوں گا۔

نہیں پھر یہ تو فرمائش ہو جائے گی۔

شمیم سوچ میں پڑ گیا۔

میری لائی ہوئی چیز اگر تمہیں پسند نہ ہوئی تو۔

یہ کیسے ممکن ہو گا۔ آپ جو کچھ بھی لا کر دیں گے میں اسے اپنی ہی پسند سمجھوں گی۔

اچھا پھر میں اپنی پسند کی کوئی چیز لے آؤں گا۔

سمیرا خوشی میں جھوم گئی۔

کب؟

کل ہی لے آؤں گا۔

سمیرا نے دیدہ پر شوق سے شمیم کی طرف دیکھا پھر مسکرائی اور واپس مڑ کر باہر نکل گئی۔ شمیم سونے کی تیاری کرنے لگا۔

رفعت کی نسبت پہلے ہی انجم سے طے ہو چکی تھی اور وہ اس کی زلف گرہ گیر ہونے کے بعد خوش بھی تھی کیونکہ دونوں ایک دوسرے کو والہانہ چاہتے تھے۔ شکیلہ رہ گئی لیکن وہ بھی ان بکھیڑوں سے نہ بچ سکی۔ شمیم کی خوب صورتی، اس کی جان لیوا ادائیں اور اطوار اس پر کچھ اس طرح اثر انداز ہوئے کہ یہ جاننے کے باوجود کہ سمیرا شمیم کو دیوانہ وار چاہتی ہے وہ بڑی تیزی سے اس کی طرف بڑھی اور اسے اپنا حق سمجھنے لگی۔

دوسرے روز شمیم دوپہر سے کچھ قبل بازار سے شاپنگ کے بعد واپس اپنے کمرے میں داخل ہوا تو شکیلہ پہلے ہی اس کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ شمیم اسے یہاں دیکھ کر بھونچکا سا رہ گیا۔ منہ سے کچھ کہنا چاہتا ہی تھا کہ وہ خود ہی بول پڑی۔

آپ کہاں چلے گئے تھے۔

شمیم بدحواس ہو گیا۔

جی ... وہ ... میں ذرا شاپنگ کے لئے گیا تھا۔

کسی کو بتا تو دیا ہوتا۔

بس ذرا جلدی میں چلا گیا۔

میں ایک گھنٹے سے یہاں بیٹھی آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔

کوئی کام ہے؟

ہاں۔

کیا؟

پہلے آپ یہ بتائیے کہ آپ کے پاس کیا ہے۔ اس نے شمیم کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے گتے کے ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔

تحفہ لایا ہوں کسی کے لئے۔

شکیلہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

کون خوش نصیب ہے وہ؟

یہاں نہیں وہ بہت دور ہے۔

ہے کون پتہ تو چلے؟

پھر کبھی بتاؤں گا۔

جواب دینے کے لئے اس کے لب کھلے ہی تھے کہ باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ فوراً اپنی جگہ سے اٹھی اور اپنے پاس ہی رکھا ایک بنڈل شمیم کی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔

یہ لیجئے۔

شمیم نے پریشان ہو کر پوچھا۔

یہ کیا۔؟

کھول کر دیکھ لیجئے میں تو چلی۔

وہ بڑی تیزی سے باہر نکل گئی۔ شمیم نے جب بنڈل کھولا تو طرح طرح کی چیزیں

میز پر بکھر گئیں۔ وہ دنگ رہ گیا۔ بنڈل بھی کیا تھا پورا جنرل سٹور تھا۔ شیونگ سیٹ ٹائی پنز۔ رومال، ٹائیاں خوشبودار تیل، عطریات اور سینٹ رنگ برنگ کے کنگھے طرح طرح کی جرابیں، بنیان، دھوپ کے چشمے اور ہیر کریم۔

شمیم متحرک سا میز پر بکھرے ہوئے سامان کو دیکھ رہا تھا کہ سمیرا اندر داخل ہوئی۔ میز پر نگاہ پڑتے ہی وہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

شمیم! یہ کیا؟

شمیم نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

دیکھ لو۔ میں تو خود حیران ہوں۔

کون رکھ گیا ہے۔

شکیلہ۔

شکیلہ؟ سمیرا نے حیرت سے پوچھا۔

ارے تم پریشان کیوں ہوگئیں۔؟

میں کیوں پریشان ہونے لگی۔ میری وہ چیز لائے آپ؟

ہاں۔

کہاں ہے دکھائیے تو۔

شمیم نے گتے کا بند پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

کیا لائے ہیں؟

خود کھول کر دیکھ لو۔

سمیرا نے جب پیکٹ کھولا تو فرطِ نشاط سے وہ ناچ اٹھی۔ ایک نہایت قیمتی ہلکے رنگ کی باڈر والی ریشمی ساڑھی تھی اور ایک شوخ رنگ کا بلوز۔

شمیم نے فسوں خیز ادا سے پوچھا۔

کیوں پسند ہے؟

سمیرا نے والہانہ محبت اور چاہت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

آپ چیز لا کر دیں۔ اور میں پسند نہ کروں۔ بھلا کیونکر ممکن ہوگا۔

اچھا اب میرا ایک کام کرو۔

کہیے۔

یہ سامان کہیں ٹھکانے لگاؤ۔ شمیم نے میز پر بکھری ہوئی چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سمیرا فوراً آگے بڑھی۔ کچھ ضروری سامان اس کے ڈریسنگ ٹیبل پہ جمایا اور باقی سامان کی الماری، اٹیچی اور بکس میں بڑے قرینے سے جانے لگی۔

دوسرے روز اتوار تھا۔ سب دھوپ میں کرسیوں پر بیٹھے تھے کہ شمیم کے نام دو پارسل اور ایک خط آیا۔ شمیم خط پڑھنے لگا اور سمیرا نے جلدی جلدی دونوں پارسل کھول ڈالے ایک میں شمیم کے لئے گرم سوٹ تھا اور دوسرے میں سنہری چین کی امیگا گھڑی اور ایک سونے کی انگوٹھی جس پر شمیم کا نام بھی تھا۔

ندیم اور انجم بھی قریب بیٹھے تھے۔ ندیم نے عمیق نگاہوں سے شمیم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

شمیم! کہاں سے آئے ہیں یہ پارسل؟
شمیم نے خط پڑھتے پڑھتے جواب دیا۔
میری ایک محسن ہیں۔ انہوں نے میرے پاس ہونے کی خوشی میں بھیجے ہیں۔
اس دفعہ انجم بولا۔
تم نے پہلے تو کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔
شمیم نے مختصر مگر معقول جواب دیا۔
کبھی چھیڑا ہی نہیں۔ خود ابتدا کرنے کی کوئی ایسی ضرورت بھی نہ تھی۔
ندیم نے پھر پوچھا۔
کیا کام کرتی ہیں؟
لیڈی ڈاکٹر ہیں۔
ندیم نے طنز کیا۔
دونوں ہم پیشہ ہو خوب نبھے گی۔
شمیم نے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا۔
کیا مطلب؟
ندیم نے اس طرح روانی سے کہا۔
مطلب صاف ہے۔ خوب نبھے گی جو مل بیٹھیں گے دو ہم پیشہ
شمیم کا لہجہ ترش اور غضب آلود ہو گیا۔
ندیم! غلط قیاس آرائیاں نہیں کیا کرتے۔

غلط کیسے ہے ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں۔
شمیم اس دفعہ غصہ میں زور سے غرایا۔
ندیم!
شمیم کو غصے میں دیکھ کر پاس ہی بیٹھی ہوئی رفیعہ بھی بول اٹھی۔
ندیم! کیا بیہودہ گوئی پر اتر آئے ہو۔ سمجھ نہیں آتی کس قماش کے آدمی ہو تو تم۔
یہ شمیم کا ذاتی معاملہ ہے۔ تم دخل اندازی کیوں کرتے ہو۔
اتنی ذاتی معاملہ ہے تو اس قدر غصے میں آنے کی کیا ضرورت ہے۔
رفیعہ بھی غضبناک ہو گئی۔
چپ رہو ندیم اٹھ جاؤ یہاں سے۔
ندیم فوراً وہاں سے اٹھ گیا۔ شمیم بھی اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ پھر اکسی کی پروا کے بغیر شمیم کے پارسل اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے اس کے کمرے میں چلی گئی۔
دن گزرتے رہے۔ شمیم اب وہ پہلا سا شمیم نہ تھا۔ وہ انجم اور ندیم کی طرح ایک ایسا کامیاب ڈاکٹر تھا جو اپنی فطرت ذہانت اور خداداد قابلیت کی بنا پر انجم اور ندیم دونوں کو بڑی تیزی سے پیچھے چھوڑتا جا رہا تھا۔

۱۵

سمیرا ایک روز باغیں باغ سے پھول توڑ کر واپس اپنے کمرے کی طرف جا
لگی تھی کہ کیلے کے درختوں سے ڈھکے ہوئے تنگ راستے میں ندیم سے مڈبھیڑ ہو گئی
ندیم نے ایک خاص ادا سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

کیا ہو رہا ہے سمیرا؟

سمیرا نے پھولوں کی ٹوکری میں ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔

پھول توڑے ہیں۔

کوئی خاص فنکشن ہے کیا؟

نہیں تو بس یونہی گلدانوں کے لئے۔

کسی ملازمہ کو کہہ دیا ہوتا پھول توڑ دیتی۔

سمیرا نے دوپٹے کا پلو اپنے سینے پر درست کرتے ہوئے کہا۔

کوئی اتنا مشکل کام تو ہے نہیں جو آدمی خود نہ کر سکے۔

پھول پھول کو توڑنے حیرت ہے۔

سمیرا نے ذرا جواب طلب نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔

کیا مطلب؟

میرا مطلب ہے.. وہ... ندیم کچھ بوکھلا گیا۔

پھر وہ بڑی تیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

سمیرا شاید اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا سکی۔

ایک طرف ہٹتے ہوئے آگے نکلنے کی کوشش کی۔

ندیم نے فوراً اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

رک جائیے اتنی بھی جلدی کیا ہے۔

سمیرا نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے پرزور احتجاج کیا۔

ندیم!

ندیم بھی ڈھٹائی پر اتر آیا۔

گل چیں جب پھول توڑنا چاہتا ہے تو پھول برا تو نہیں مانتا۔ بلکہ ٹہنی سے جدا ہونے کے بعد بے اختیار اس کی گود میں گر جاتا ہے۔

سمیرا غصہ پر اتر آئی۔

یہ فلسفہ آپ اپنے پاس ہی رکھئے۔ ہٹئے مجھے جانے دیجئے۔

اگر میں نہ ہٹوں تو ؟ اس کی آواز میں رعونت تھی۔

تو ۔۔ تو پھر آپ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔

میں تو کچھ بھی نہیں جانتا۔ ہاں اگر آج اگر کچھ معلوم ہو جائے تو شاید میری توقع

ہو۔

سمیرا کا لہجہ اور سخت ہو گیا۔

ندیم! میں ایسی باتیں سننے کی عادی نہیں ہٹو پیچھے۔

ندیم دونوں بازو سینے پر جماتے ہوئے بولا۔

میں تو ہٹنے کا نہیں۔

خالہ جان سے کہہ دوں گی۔

کہئے۔ میں ان سے ڈرتا تھوڑا ہی ہوں۔

سمیرا ایک طرف سے پھر آگے بڑھی۔

ندیم نے اس بار اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

سمیرا نے ہاتھ چھڑا لیا اور بپھر گئی۔

شرم آنی چاہیئے تمہیں تعلیم یافتہ ہو کر ایسی حرکتیں کرتے ہوئے کیا یہی کچھ سیکھ

کر آئے ہو امریکہ سے۔

تم لوگ یہاں سے ایک صاف ستھری تہذیب کا لبادہ اوڑھ کر جاتے ہو اور مغرب

سے والیسی پر وہاں اس کے بدلے بدنما اور داغ دار تہذیب کے اشتہار بن کر یہاں

چلے آتے ہو۔ اس طرح تم اپنے ہی کردار کو تباہی کے اندھے کنوئیں میں نہیں دھکیلنے

ے رجعت پسندی کا نام دے کر اپنے ملک میں بے حیائی اور بے حمیتی کے

ر کی جراثیم پھیلا کر معاشرے کے لئے ایک لعنت بن جاتے ہو۔ تف ہے تم جیسے

ان کی زندگی پر۔

ندیم نے کچھ بے حیائی سے کہا۔

بس! ختم ہو گیا لیکچر؟

ندیم! ابھی تک میں تمہیں اس لئے طرح دیتی رہی کہ شاید تم انسانوں کی طرح

بولو۔ اگر تم نے زیادہ دیر ڈھٹائی سے کام لیا تو ایسی مرمت کروں گی زندگی بھر

رو گے۔

ندیم کچھ ڈھیلا پڑ گیا۔

ایک شرط پر ہٹنے کے لئے تیار ہوں۔

سمیرا نے بھی کچھ سکون محسوس کیا۔

وہ کیا؟

یوں نہیں۔ پہلے وعدہ کرو تم مان جاؤ گی۔

میرے بس کی بات ہوئی تو ضرور مان جاؤں گی۔

ہے تمہارے بس کی۔

تو پھر کہو۔

نہیں پہلے وعدہ ہو جائے۔

کہنا ہے تو کہو۔ دماغ خراب مت کہو۔

ندیم نے کھنکارتے ہوئے کہا۔

آئندہ تم میرے ساتھ فری ہو کر باتیں کیا کرو گی۔

وہ تو میں پہلے ہی کرتی ہوں مگر بھائی سمجھتے ہوئے۔

ندیم نے بھی پینترا بدلا۔

تو کیا تم سمجھتی ہو۔ میں تمہیں بہن نہیں سمجھتا

لیکن آپ کی یہ حرکتیں تو بھائی جیسی نہیں۔

پگلی یہ تو مذاق تھا۔

سمیرا حیران رہ گئی۔

سچ؟

تو کیا تم اسے حقیقت سمجھنے لگی تھیں؟

ہاں مجھے تو کچھ یوں ہی محسوس ہوا تھا۔

نہیں نہیں! میں بھلا مذاق کے علاوہ ایسی حرکتیں کر سکتا ہوں۔ ندیم کی باتوں میں بے ایمانی کا شائبہ تھا۔

سمیرا نے ایک لمبا سانس لیا۔

اف یہ اتنا بڑا مذاق۔

اسی لمحہ انجم اور شمیم بھی کوٹھی سے باہر آتے۔ انجم تھوڑا آگے تھا اور شمیم اس سے کوئی دس قدم پیچھے۔ لیکن ندیم اور سمیرا دونوں کی آمد سے بے خبر رہے۔

ندیم نے اپنا ہاتھ ہوا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔

سمیرا تو پھر وہ وعدہ پکا ہوا نا؟

غیر ارادی طور پر سمیرا کا ہاتھ بھی آگے نکل گیا۔

بالکل۔

ندیم نے اپنا ہاتھ اسکے ہاتھ پر دے مارا۔

اور دونوں کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

شمیم نے کیلے کے درختوں کی اوٹ میں جو منظر دیکھا تو غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہوا۔ اور پیشانی پر نفرت کے بل پڑ گئے۔ آگے بڑھنے کی بجائے وہ گلاب کی جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو گیا۔

انجم آگے بڑھا۔ اس کے پاؤں کی آہٹ پاتے ہی ندیم اور سمیرا چوکنے ہو گئے۔

انجم نے ان سے قریب ہوتے ہوئے پوچھا۔

کیا ہو رہا ہے ندیم؟

ندیم بدحواسی کا شکار ہو گیا۔

وہ... ہم... ذرا سینما کا پروگرام بنایا ہے انجم۔

انجم نے کسی قسم کے شبہ کا اظہار کئے بغیر پھر پوچھا۔

کب؟

آج ہی۔ اور ابھی چلنا ہے پہلے شو پر۔

انجم نے اس دفعہ سمیرا سے پوچھا۔

کیوں سمیرا! ہے خیال سینما کا۔

سمیرا جو ندیم کے ساتھ اس طرح علیحدگی میں کھڑی شرم اور حیا سے زمین میں گڑی جا رہی تھی اس کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکی۔

جی ... جی ہاں۔

شمیم ان کی یہ باتیں سن کر غصے اور نفرت سے بل کھانے لگا ایک دفعہ اس کا پورا جسم کانپ گیا۔ آگے بڑھنے کے بجائے وہ وہیں سے اپنے کمرے کو واپس لوٹ گیا۔ بدگمانیاں اپنا کام کر چکی تھیں۔ شمیم کے ذہن میں شبہات کا رنگ بھر گیا۔ سمیرا کو اس کی خبر نہ تھی کہ ندیم اور اس کی یہ ملاقات خواہ وہ کیسی ہی تھی شمیم کی نگاہوں میں آ چکی ہے اور یہ کہ مستقبل قریب میں ندیم سے یہی ملاقات اس کی زندگی کو خاردار اور دہکتا جہنم بنا ڈالے گی۔

شمیم واپس چلا گیا۔ اس کے دل میں ایک گرہ سی پڑ گئی تھی۔ انجم پھر سمیرا سے مخاطب ہوا۔

سمیرا! جلدی کرو۔ پھر لیٹ ہو جائیں گے۔ ٹائم بالکل تھوڑا رہ گیا ہے تم جا کر اپنے کمرے میں تیاری کرو۔

پھر ندیم کی طرف دیکھ کر کہا۔

ندیم! تم جا کر شمیم کو جلدی کے لئے کہو۔ میں شکیلہ اور رفعت کو تیاری کے لئے کہتا ہوں۔

سمیرا اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ندیم اور انجم بھی تیاری کرنے لگے۔

رفعت، انجم اور شکیلہ فوراً تیار ہو کر باغیچے میں گھاس کے پلاٹ میں پڑی ہوئی

کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ندیم نے شمیم کو تیار ہونے کے لئے کہا۔ لیکن اس نے ناسازیٔ طبع کا کہہ کر ٹال دیا۔ ندیم بھی انجم کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اب سب سمیرا کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگے۔

سمیرا بھی تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکلی۔ آج اس نے پہلی دفعہ شمیم کی لائی ہوئی ساڑھی اور بلوز پہنا تھا اور اس کا دہکتی جوانی میں ڈوبا ہوا چکنا، سفید اور گداز جسم خوب صورت ریشمی لباس میں کچھ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے

جیسے۔

بھڑکتی آگ کے شعلوں میں دہکتے ہوئے انگارے۔

سمیرا نے جب دیکھا کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ شمیم نہیں ہے تو اس نے سیدھا اس کے کمرے کا رخ کیا۔ جب وہ اندر داخل ہوئی تو شمیم دونوں ہاتھوں میں سر تھامے کرسی پر بیٹھا کسی گہری سوچ میں غوطہ زن تھا۔

اسے اس حالت میں دیکھ کر سمیرا کا دل کھٹکا۔ آگے بڑھ کر پیار سے کہا۔

شمیم! کیا بات ہے؟

شمیم نے کوئی جواب نہ دیا۔

سمیرا اور زیادہ فکرمند ہو گئی۔

خیریت تو ہے؟

شمیم پھر خاموش تھا۔

سمیرا آگے بڑھی اور اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

کیا بات ہے۔ آپ اس طرح چپ کیوں ہیں؟

شمیم نے نہ اس کا ہاتھ ہٹایا نہ ہی کوئی جواب دیا۔

سمیرا جھلا گئی۔

کیا نہ بولنے کی قسم کھا رکھی ہے۔

شمیم نے اس دفعہ آہستہ آہستہ اپنا سر اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

ہوں!

سمیرا نے شکایتاً کہا۔

اتنی دیر سے بلا رہی ہوں اور اب کہا ہے۔ ہوں۔

کیا بات ہے؟

چلئے چلیں۔

کہاں۔

سینما۔ ندیم نے آپ سے نہیں کہا۔

شمیم نے خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نہیں جاؤں گا۔

سمیرا بھی ضد پر اتر آئی۔

کیوں نہیں جائیں گے آپ؟

اس نے بے گانہ وار کہا۔

میری مرضی۔

آپ کی مرضی تھوڑی چلے گی۔ دیکھئے سب باہر بیٹھے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔

شمیم کا انداز کا سخن کرخت ہو گیا۔

میں کیا کروں تم جاؤ ہو آؤ۔

آپ کو بھی جانا ہو گا۔

شمیم زور سے چلایا

سمیرا تنگ نہ کرو جاؤ چلی جاؤ۔

شمیم نے روہانسی آواز میں کہا۔

کیا ہو گیا ہے آپ کو۔

شمیم کی آواز میں درد بھی درد اور سوز تھا۔

پاگل ہو گیا ہوں۔

سمیرا بے چین ہو گئی۔

پاگل ہوں آپ کے دشمن۔ میں نے طبیعت کا پوچھا ہے۔ اور آگے سے الٹے جواب دینے لگے ہیں۔

میں کوئی بیمار تو ہوں نہیں۔

تو پھر جھگڑا ہوا ہے کسی کے ساتھ۔

اوں۔ ہوں۔

تو پھر آپ اس قدر الجھے الجھے کیوں ہیں ۔

شمیم نے طنز کیا۔

میں الجھا دیا گیا ہوں ۔

آخر آپ نہ جانے پر بضد کیوں ہیں۔ پہلے تو میں ایک ہی دفعہ کہتی تھی تو آپ فوراً تیار ہو جایا کرتے تھے۔ سمجھ نہیں آتی کہ آپ بیگانہ خو کیوں ہوتے جا رہے ہیں ۔

شمیم نے بے رخی سے کہا۔

میں ہر وقت تمہارے ساتھ رہنے پر پابند تھوڑا ہی ہوں ۔

سمیرا نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

شمیم!

جاؤ سمیرا چلی جاؤ ۔

آپ صاف صاف مجھے بھی جانے سے روک کیوں نہیں دیتے ۔

میں کیوں روکنے لگا۔ پہلے کبھی مجھ سے پوچھ کر بھی کہیں گئی ہو۔

میں کہیں ایسی جگہ گئی ہی کب ہوں۔ جہاں آپ سے پوچھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ۔

مَیں نے تمہیں کہا بھی کب ہے کہ مجھ سے پوچھ کر جایا کرو۔

سمیرا رونے لگی۔

شمیم نے پُرسوز آواز سے کہا ۔

سمیرا جاؤ چلی جاؤ۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ سمیرا! خدا کے لئے چلی جاؤ ۔

سمیرا روتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس نے سینما جانے کا ارادہ منسوخ کر دیا۔ اپنے کمرے کی طرف جانے کے لئے برآمدے میں آئی ہی تھی کہ ندیم باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے سمیرا کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے جاتے ہوئے کہا ۔

سمیرا! شمیم کی طبیعت ناساز ہے ویسے بھی وہ سینما کا شائق نہیں۔ آؤ چلیں۔

شمیم سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

سمیرا نیم بے حسی کی حالت میں طوعاً و کرہاً کار میں بیٹھ کر ان کے ساتھ چلی گئی شمیم انگاروں پر لوٹتا رہ گیا۔

۱۶

سینما سے لوٹ کر باقی لوگ غسل کرنے لگے۔ سمیرا شمیم کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ شمیم کمرے میں نہیں تھا۔ صرف نازلی اس کا بستر درست کر رہی تھی۔ سمیرا کچھ دیر چپ کھڑی رہی پھر نازلی سے پوچھا۔

نازلی شمیم کہاں ہیں۔

نازلی نے گہری نگاہوں سے سمیرا کو دیکھ کر کہا۔

جی وہ تو کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔

سمیرا نے بے چین ہو کر پوچھا۔

کہاں گئے ہیں؟

بتا کر نہیں گئے۔

چند لمحے سکوت رہا۔ پھر نازلی بولی۔

مالکن ایک بات پوچھوں۔

سمیرا کچھ فکرمند ہو گئی۔

پوچھو۔

شمیم بھائی سے کچھ کہا آپ نے؟

میں نے تو کچھ نہیں کہا۔ کیوں؟

وہ آج سخت پریشان اور اداس تھے۔

تم نے کیسے جانا۔

وہ جب کمرے سے باہر جانے لگے تھے تو میں دیکھ رہی تھی ان کی چال میں لغزش تھی۔ جیسے ابھی گرنے لگے ہیں۔ چہرہ ان کا کچھ اس طرح دکھائی دیتا تھا جیسے بہت بڑے غم میں مبتلا ہیں۔

سمیرا نے بے تاب ہو کر کہا۔

تم نے پوچھ لیا ہوتا۔ کہاں گئے ہیں۔

میں نے پوچھا تھا۔

پھر کیا کہا انہوں نے۔

بس ادھر ادھر کی کہہ کر ٹال گئے۔

نازلی نے کچھ سوچ کر کہا۔

مالکن! ایک اور بات بھی دیکھی میں نے۔

سمیرا کا لہجہ اور فکر انگیز ہو گیا۔

کیا ؟

میں نے جب ان کی حالت دیکھ کر انہیں باہر جانے سے روکا۔ تو ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک گئے۔

سمیرا بھی آبدیدہ ہو گئی۔

نازلی۔

سچ کہتی ہوں مالکن۔ آج ان کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔

سمیرا آنسو پونچھتی ہوئی باہر نکل گئی۔ نازلی پھر بستر کی جھاڑ پھونک کرنے لگی۔

شام کھانے پر بھی شمیم نہ پہنچا۔ آج پہلی دفعہ سب کے ساتھ کھانا کھانے سے [illegible] غیر حاضر ہوا تھا۔ رفیعہ اور عظیم بار بار نازلی سے پوچھتے لیکن ہر بار اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ رفیعہ نے کئی بار خود بھی شمیم کے کمرے کے چکر لگائے۔ لیکن کمرہ خالی تھا اور شمیم کہاں غائب تھا۔ سمیرا سب کے ساتھ بیٹھ تو گئی۔ لیکن کھانا اس کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔ بار بار ذہن میں یہی الفاظ ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے۔

شمیم جانے کہاں ہے۔ دن کو ان کی طبیعت بھی ناساز تھی۔ خدا خیر ہی کرے۔

کھانے کے بعد سب ڈرائینگ روم میں شمیم کا انتظار کرنے لگے۔ نازلی برتن صاف کرنے رسوئی چلی گئی۔ اور سمیرا اپنے کمرے میں اس کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔ شمیم بڑے گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ اس کا بایاں ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا۔ اور دایاں ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے۔ گردن جھکائے جب وہ چند قدم آگے بڑھا

نازلی کی نظر اس پر پڑی۔ اس نے برتن چھوڑ دیئے اور شمیم کا راستہ روک کر بولی۔

ٹھہریئے شمیم بھائی۔

شمیم رک گیا۔

کہاں گئے تھے آپ ؟

شمیم جو نہ جانے کن خیالوں میں غرق چلا آ رہا تھا کچھ سنبھلتے ہوئے بولا۔

کیا کہا ؟

کہاں چلے گئے تھے آپ ؟ نازلی نے ذرا اونچی آواز سے کہا۔

کہیں بھی نہیں۔

کہیں تو گئے تھے۔

ذرا گھومنے چلا گیا تھا۔

کھانے پر نہیں پہنچے آپ ؟

ہاں آج ذرا بھوک نہیں تھی۔

آج دن سے آپ کچھ پریشان ہیں کیا وجہ ہے ؟

کچھ نہیں۔

بتلایئے نا۔ ضد نہ کیجئے۔

شمیم خاموشی سے اسے گھورنے لگا۔

نہیں بتائیں گے ؟

نازلی کچھ رک کر پھر بولی۔

شمیم بھائی! شاید میں اس طرح بضد ہو کر آپ سے نہ پوچھتی۔ لیکن ایک بار آپ نے مجھے خود بہن کہا تھا۔ بس اسی بہن کے رشتے نے بار بار پوچھنے پر مجبور کیا ہے۔

شمیم نے اس کا سر سہلاتے ہوئے تسلی دی۔

نازلی! تم اب بھی میری بہن ہو۔ اور تمہارے ساتھ ہمیشہ کے لئے میرا یہی رشتہ رہے گا۔ لیکن تم ویسے ہی معمولی سی بات کو لے بیٹھی ہو۔ بس دن کو طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ ذرا جی بہلانے شہر گھومنے کے لئے چلا گیا تھا۔

نازلی نے سر جھکاتے ہوئے روہانسی آواز میں کہا۔

چلئے میں آپ کو کھانا نکال دوں۔

نہیں مجھے بھوک نہیں تم اپنا کام کرو۔

شمیم اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ نازلی پھر اسی طرح کام میں مصروف ہو گئی۔

جونہی وہ لباس تبدیل کر کے اپنے بستر پر لیٹا سمیرا اندر داخل ہوئی۔ اف اس کی حالت قابلِ دید تھی۔ نگاہیں رو رو سوجھی ہوئیں۔ ماتھے پر بالوں کی بے ترتیب لٹیں لہرا رہی تھیں۔ چال کچھ ایسی تھی جیسے پاؤں ایک ایک من کے ہو گئے ہوں۔

شمیم کے قریب ہو کر اس نے سوز بھری آواز سے پوچھا۔

کہاں سے لوٹے ہیں آپ اتنی رات گئے۔

شمیم نے بڑی بے رخی سے کہا۔

جہنم سے۔

سمیرا کا دل دہل گیا۔ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ رفیعہ اور عظیم کمرے میں داخل ہوتے

ران کے پیچھے پیچھے رفعت، شکیلہ، انجم اور ندیم بھی۔ شمیم کی بدلی ہوئی حالت دیکھتے
ی رفیعہ نے بے چین ہو کر پوچھا۔

کہاں چلے گئے تھے میرے لال؟

شمیم نے لیٹے ہی لیٹے کہا۔

خالہ جان طبیعت کچھ ناساز تھی۔ ذرا باہر گھومنے چلا گیا تھا۔

رفیعہ اور عظیم اس کے قریب کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے۔ باقی سب اس کے گرد
کھڑے رہے۔

رفیعہ پھر بولی۔

کھانا کھا لیا بیٹا؟

نہیں۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔

اس دفعہ عظیم بولے

تھوڑا سا کھا لو بیٹا۔ ٹھہرو تمہارا کھانا یہیں منگا لیتے ہیں۔

نہیں خالو جان۔ کھانے میں تکلف کیسا۔ میرا بالکل جی نہیں چاہ رہا۔

رفیعہ نے پہلے شمیم کا بازو پکڑ کر نبض دیکھی۔ پھر جو اس نے پیشانی پر ہاتھ رکھا
ہ کر رہ گئی۔ شمیم کا جسم برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ اس کے باوجود اس کا چہرہ اور
ی عرق آلود تھی۔ رفیعہ کسی سوچ میں پڑ گئی۔ پھر بڑے پیار سے شمیم کے بالوں میں
گی کرتے ہوئے پوچھا۔

شمیم تمہیں اچانک کیا فکر اور غم لاحق ہو گیا ہے بیٹا؟

شمیم نے پھیکی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

خالہ جان! بھلا آپ کے زیرِ شفقت مجھے کونسا غم ہو سکتا ہے۔

تو پھر کیا وجہ ہے۔

کچھ بھی نہیں۔

کیسے مان لوں بیٹا! تم ضرور کسی بات پر پردہ ڈالے ہوئے ہو۔ دیکھو ارم کا سامنہ نکل آیا ہے میرے لال کا۔

جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

تو پھر اس بے چینی اور بے قراری کی وجہ؟

شمیم کو اس بار جانے کیا ہوا چلاتے ہوئے بولا۔

خالہ جان! مجھے تنہا چھوڑ دیجئے۔ میرا دل ڈوب رہا ہے۔ میں پاگل ہو جاؤں گا خدا کے لئے چلے جائیے یہاں سے۔ اگر آپ لوگ نہیں جاتے تو میں چلا جاتا ہوں یہاں سے۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

رفیعہ نے اسے شانے سے پکڑ کر پھر لٹا دیا۔

شمیم کے کہے ہوئے الفاظ میں کچھ ایسا درد اور سوز تھا کہ سب اپنے آنسو پو ہوتے اس کے کمرے باہر نکل گئے۔ سمیرا بھی اپنا چہرہ دوسروں سے چھپاتی ہوا باہر نکل گئی۔

گھر کے سب افراد جب گہری نیند سو گئے تو سمیرا پھر شمیم کے کمرے کی طرف

دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے شیشے میں جھانکا شمیم بستر پر دراز تھا۔ اس کی ھیں اور کسی گہری سوچ میں غرق وہ ٹکٹکی باندھے چھت کی طرف دیکھ رہا تھا نظر دیکھ کر خوف سے کانپ گئی۔ دو تین بار اس نے دروازے پر ہلکے ہلکے ھی دی۔ لیکن شمیم نے نہ دروازہ کھولنا تھا نہ کھولا۔ سمیرا واپس اپنے کمرے ی۔ اور ساری رات آنسوؤں میں ڈوب کر نکال دی۔

بدگمانیاں اور بدشگونیاں جب کہیں وارد ہوتی ہیں تو اپنے تمام ذرائع سے آتی ہیں۔ یہی حال کچھ شمیم اور سمیرا کے رشتے کا بھی ہوا۔ شمیم کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اب وہ اکثر کافی رات گئے تک گھر سے باہر رہنے لگا۔ طرف سمیرا بھی بے تعلقی کی آگ میں جل جل کر راکھ ہوئی جا رہی تھی۔ ایک ے واقعے نے دونوں کے درمیان بدظنی کی سلگتی آگ پھیلا دی۔ لیکن چند اور حادثہ ایسا پیش آیا کہ بدظنی کی یہی سلگتی آگ ایک خطرناک شعلہ بن کر

دن بعد ایک روز اتوار کو رفعت اور شکیلہ نے اپنی سب سہیلیوں کو اپنے کافی دیر تک وہ ان کے ساتھ چائے اور اس کے ساتھ دوسرے لوازمات سمیرا بھی ان میں شامل رہی۔ پھر کوٹھی کے باغیچے میں آنکھ مچولی شروع ی درمیان میں وہ واقعہ پیش آیا جس نے شمیم کے دل میں بدظنی کی آگ ھڑکا دی۔

ت سمیرا کی چوٹی ایک درخت سے باندھ کر اپنی سہیلیوں کے ساتھ ادھر

اُدھر چھپ گئی۔ شمیم اس وقت کوٹھی کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ منظر یہیں تک رک جاتا اور سمیرا کی چوٹی درخت سے بندھی رہتی تو شاید بات گہرائی میں نہ جاتی۔ لیکن عین اسی لمحہ ندیم باغیچہ میں سمیرا کے پاس آ گیا۔ سمیرا نے فوراً اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

ندیم بھائی! دیکھئے رفعت باجی میری چوٹی درخت سے باندھ گئی ہیں۔ ذرا کھول دیجئے نا۔

باغیچہ میں سمیرا کی آواز سن کر شمیم کمرے کی کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اور جب اس نے نیچے دیکھا اس کا چہرہ رقابت کی آگ میں جل اٹھا۔ سمیرا اور ندیم پاس پاس کھڑے تھے۔

سمیرا کی آواز پھر اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔

کھول دیجئے نا۔

شمیم نے جب یہ الفاظ سنے تو چکرا گیا۔ اُسے محسوس ہونے لگا۔ جیسے اس کا دل نیچے ہی نیچے ڈوبتا جا رہا ہو۔ تاہم وہ اپنے آپ کو قابو میں رکھے وہیں کھڑا رہا۔

ندیم آگے بڑھا اور بڑے پیار سے سمیرا کی طرف دیکھ کر کہا۔

ایک شرط پر کھولوں گا۔

سمیرا نے ملتجی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

وہ کیا؟

تم اپنے اس وعدے پر سختی سے عمل کرو گی۔

کون سا وعدہ؟

وہی باتیں کرنے والا۔

منظور ہے۔

سچ؟

بالکل سچ۔

ندیم آگے بڑھ کر سمیرا کی چوٹی کھولنے لگا۔ کھڑکی میں کھڑا شمیم یہ منظر برداشت نہ کر سکا اور فوراً پیچھے ہٹ کر کرسی پر نڈھال ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کا پورا جسم پسینوں میں ڈوب چکا تھا۔

۱۷

شمشیم اب گھر سے بے تعلق سا ہوتا جا رہا تھا۔ رات کے کھانے پر سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا پھر اپنے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر کے پڑا رہتا۔ سمیرا سے اس نے اب قطع کلامی کر رکھی تھی۔ اور نہ ہی وہ اسے کوئی ایسا موقع مہیا کرتا کہ وہ اس سے کھل کر بات کر سکے۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے سے بدظن ہو کر درد اور غم کی ناقابلِ برداشت آگ میں جلتے رہے۔ سمیرا ہر وقت کوئی فیصلہ کن بات کرنے کے لئے بے تاب رہتی۔ لیکن شمیم گھر بیٹھتا ہی کہاں تھا۔ رفیعہ شمیم کی اس حالت پر خون کے آنسو بہاتی۔ بار بار اس سے اس کی سنجیدگی اور خاموشی کی وجہ پوچھتی۔ لیکن شمیم نے تو جیسے چپ سادھ لی تھی۔

ایک دن رفیعہ اور عظیم کہیں دعوت پر گئے ہوئے تھے رفعت بھی شکیلہ کے ساتھ

یل کے ہاں چلی گئی تھی۔ شمیم اپنے کمرے میں پڑا تھا۔ ندیم اور انجم ڈرائینگ روم میں یرا ہر گھاس کے تختے پر بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ شمیم کو اپنے کمرے میں اکیلا دیکھ کر ورقع کو غنیمت جانا۔ اُٹھ کر شمیم کے کمرے کی طرف جانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ انجم ل روم سے نکل کر شمیم کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ سمیرا کی آرزو حسرت بن کر رہ

ا جو بہنی کمرے میں داخل ہوا کرسی پر بیٹھا ہوا شمیم اپنا سر اوپر اٹھائے بیٹھا رہا۔ ی کھینچ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ دونوں چند منٹ تک خاموش بیٹھے رہے۔

ے پوچھا۔

یم! یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے؟

یم نے فوراً بہانہ بنایا۔

ی ابھی سو کر اٹھا ہوں بھیا۔ اس لئے طبیعت ذرا بوجھل سی ہے۔

یم خاموش ہو گیا۔ سر جھکاتے ہوئے کچھ سوچا۔ اور سلسلہ کلام شروع کیا۔

یم! میں تم سے ایک اہم موضوع پر بات کرنے آیا ہوں۔

یم چونک پڑا۔

ئے۔

گھر میں ایک نیا فتنہ کھڑا کر رہے ہے۔

یم کا ذرا سا منہ نکل آیا۔

آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی جو کسی کے لئے باعثِ

آزار ہو۔

تم نے اپنی جو حالت بنا رکھی ہے۔ اس سے گھر کے سب افراد نالاں ہیں۔

میری حالت کو کیا ہے اس کی آواز میں جستجو تھی۔

اپنے دل سے پوچھو۔ تم نے صرف ندیم اور سمیرا کی محبت سے جل جل کر یہ حالت بنالی ہے۔

شمیم زور سے چلایا۔

بھیا!

تمہیں دکھ ضرور ہوگا شمیم! لیکن تمہیں ہر بات برداشت کرنا ہوگی۔ سنو! ندیم اور سمیرا ایک دوسرے کو والہانہ چاہتے ہیں۔ تم ان کی راہ میں رکاوٹ بن رہے ہو۔ اور شاید یہ خبر بھی تمہارے لئے نئی ہو کہ ندیم اور سمیرا کی منگنی بھی ہو چکی ہے۔ اور پرسوں خالہ اور خالو جان کا ارادہ ہے عنقریب دونوں کی شادی بھی ہو جائے گی۔ میں شاید تمہیں یہ باتیں کہنے نہ آتا لیکن میں سمیرا کے مجبور کرنے پر آیا ہوں۔ اس نے خود اپنی زبان سے میرے سامنے ندیم سے محبت کا اظہار کیا ہے۔ اس نے تم سے کہلوا بھیجا ہے کہ اسے بدنام کرنے کا جو رویہ تم نے اختیار کر رکھا ہے اسے بدل ڈالو۔

انجم اتنا کہہ کر چلا گیا۔ شمیم کے پورے بدن میں آگ سی لگ گئی چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور جسم گرم بھٹی کی طرح غصے اور غم کی آمیزش سے دہک اٹھا۔ اس کے سان گمان میں بھی ایسی باتیں نہ تھیں۔ کسی خیال سے وہ اٹھا۔ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال درست کرنے کے لئے کنگھی اٹھائی ہی تھی کہ کمرے میں کسی کی مترنم آواز

گونجی۔

کہاں کی تیاری ہے ڈاکٹر صاحب۔

شمیم نے جب مڑ کر پیچھے دیکھا اس کے پیچھے ذرا دائیں طرف سمیرا لبوں پر حشر برپا مسکراہٹ لئے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

شمیم پھر سامنے دیکھتے ہوئے کنگھی کرنے لگا۔

سمیرا فوراً سنجیدہ ہو گئی۔

کب تک آپ ایسا ہی رویہ اختیار کر رکھیں گی۔

سمیرا! اب تمہیں مجھ سے اس رویہ کی شکایت ختم ہو جائے گی۔ میں یہاں سے بہت جلد چلا جاؤں گا۔

شمیم کے لہجہ میں کچھ ایسا درد تھا کہ سمیرا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

کہاں جائیں گے آپ؟

جہاں مقدر لے جائے۔

تو کیا آپ اس گھر کو ہی چھوڑ رہے ہیں؟

خیال تو کچھ ایسا ہی ہے۔

میں آپ کو کبھی نہ جانے دوں گی۔ آخر مجھ سے کیا خطا ہوئی ہے۔ کہ آپ میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں۔

اپنے من سے پوچھو۔

میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔

شمیم کا لہجہ ہر لمحہ اکھڑتا جا رہا تھا۔

تو پھر تم نادان ہو۔

آپ ہی سمجھا دیجئے نا۔

شمیم کا انداز سخن اور سخت ہو گیا۔

میں تمہارا زر خرید غلام تھوڑا ہی ہوں۔

کچھ بھی ہو آپ کو بتانا پڑے گا۔

وہ بدمزاجی پر اتر آیا۔

میرا سر پہلے ہی چکرا رہا ہے سمیرا۔ میرے لئے اور تکلیف کا باعث نہ بنو۔

میں آج آپ سے آخری فیصلہ کر کے رہوں گی۔ سمیرا کی آواز میں سماحت تھی۔

شمیم زد سے چلایا۔

میں کہتا ہوں چلی جاؤ یہاں سے میں . . . میں . . . غصہ کی زیادتی سے اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

اس طرح جانے والی میں بھی نہیں۔

شمیم کی ایک اور چیخ بلند ہوئی۔

میں پاگل ہو جاؤں گا۔ سمیرا چلی جاؤ یہاں سے۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ بڑی تیزی سے پیچھے مڑا اور الٹے ہاتھ کا ایک پرزور تھپڑ سمیرا کے گال پر دے مارا۔ سمیرا کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ عین اسی لمحے انجم کمرے میں داخل ہوا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ فوراً آگے بڑھ کر شمیم کو گریبان

سے پکڑ کر اس کے منہ اور پیٹ پر تین چار گھونسے رسید کر دیئے۔

سمیرا سہم گئی فوراً دونوں کے درمیان حائل ہو کر قہر آلود نگاہوں سے انجم کی طرف دیکھتے ہوئے زور سے غرائی۔

بھائی جان خبردار جو آپ نے ان پر ہاتھ اٹھایا۔

انجم نے ایک جھٹکے کے ساتھ سمیرا کو ایک طرف ہٹا دیا۔ وہ بڑی بے بسی سے صوفے پر جا گری۔ شمیم اس درمیان میں شیشے کے فریم پر رکھ کر اونچے اونچے سانس لینے لگا۔

انجم پھر غراتا ہوا آگے بڑھا۔

ذلیل انسان میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا۔ کہ گھر میں فتنہ انگیزی برپا نہ کرو۔ لیکن تم نے پھر وہی حرکت کی جس سے میں نے تمہیں منع کیا تھا۔ اتنا کہتے ہی انجم نے پھر لگاتار تین چار گھونسے شمیم کے رسید کر ڈالے۔ شمیم بل کھا کر فرش پر گر گیا۔ اور وزنی آئینہ مع فریم اس کے اوپر آ رہا۔

انجم ایک فاتح کی طرح کھڑا ہو گیا۔ شمیم بڑی تیزی سے اٹھا اس کا جسم لرز رہا تھا اور آنکھوں میں غصے سے خون اتر آیا۔ یکایک اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور ایک پُرزور مکہ انجم کے رسید کرنے کے لئے اپنا ہاتھ ہوا میں اٹھایا۔ لیکن کچھ سوچتے ہوئے اس کا ہاتھ انجم کی گردن کے قریب جا کر رک گیا۔ جانے یہ حرکت اس سے بڑا بھائی سمجھ کر سرزد ہوئی یا ماں کے ان الفاظ کا نتیجہ تھی جو اس نے مرنے سے قبل کہے تھے۔

"شمیم! انجم ذرا سخت اور شریر ہے۔ اس کی ہر بات برداشت کر کے ہنسی مذاق میں اڑا دینا۔"

بہرحال وجہ کچھ بھی ہو شمیم نے اپنا ہاتھ روک لیا اور پیچھے ہٹ کر رومال سے اپنے آنسو پونچھنے لگا۔ سمیرا حیران تھی کہ تین تین چار چار آدمیوں سے اکیلا لڑنے والا شمیم انجم کے سامنے خاموش کھڑا ہو کر مار کیوں کھا رہا۔ شمیم پیچھے ہٹ کر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ انجم واپس مڑا اور سمیرا کا بازو پکڑ کر کہا۔

چلو سمیرا! آئندہ تم اس ذلیل کے کمرے میں ہی مت آیا کرو۔ سمیرا کمرے سے باہر نہ جانا چاہتی تھی لیکن انجم اسے کھینچ کر باہر لے گیا۔ اور اس کے کمرے میں چھوڑ آیا۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ شمیم اسی طرح کھڑکی میں کھڑا خلاؤں میں گھورتے ہوئے نہ جانے کن خیالات کے جال بن رہا تھا کہ اچانک باہر صحن سے نازلی کی چیخ سنائی دی۔ شمیم بیتاب ہو گیا۔ بھاگتا ہوا باہر آیا۔ برآمدے میں کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ لیکن نازلی کہیں دکھائی نہ دی۔ سمیرا بھی باہر برآمدے میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ نازلی کی چیخ پھر سنائی دی۔ آواز اس کی کوٹھڑی سے آ رہی تھی۔ شمیم نے جو نگاہیں اٹھا کر ادھر دیکھا تو نازلی کی کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا اور اس کے باہر انجم کھڑا تھا۔

شمیم بے تحاشا اس سمت بھاگنے لگا جونہی وہ انجم کے قریب پہنچا وہ مکا تانے ہوئے گرجا۔

شمیم وہیں رک جاؤ۔ خبردار جو آگے بڑھے۔

اتنے میں نازلی کی آواز بند کمرے سے پھر سنائی دی۔

ندیم! میری عصمت یوں تار تار نہ کرو۔ خدا کے لئے مجھے ننگا نہ کرو۔ چھوڑ دو ندیم! دو مجھے۔

شمیم آگے بڑھا اور دو تین چکرا دینے والے گھونسے انجم کی گردن پر مارتے ہوئے گر جا۔

ذلیل کتے کیا یہی ہے تمہاری شرافت اور غیرت۔ تف ہے تمہاری اوقات پر۔ اسی ہمت روی کہتے ہو؟

انجم زمین پر گر گیا۔ شمیم دروازہ توڑ کر جب اندر داخل ہوا۔ تو ندیم اور نازلی گتھم گتھا تھے۔ نازلی کی قمیض اور شلوار جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ اور اس کے جسم کا ہر عضو صاف نظر آ رہا تھا شمیم کو دیکھتے ہی ندیم نے نازلی کو چھوڑ دیا۔ شمیم نے سب سے پہلے نازلی کو اٹھا کر نازلی کا جسم ڈھانپا۔ اس دوران ندیم باہر نکل گیا تھا۔ شمیم بھی تیر کی مانند انجم اور ندیم واپس ڈرائینگ روم کی طرف جا رہے تھے۔ شمیم زور سے گرجا۔

رک جاؤ ندیم۔

مگر انجم دونوں رک گئے۔ شمیم ان سے قریب ہو کر زور سے غرایا۔

تم دونوں پہلے ہی میرے جذبات کو بھڑکا کر شعلے کی شکل دے چکے ہو۔ اب تم ان شعلے کو بے آبرو کرنے کی کوشش کر کے اسے اور ہوا دی ہے۔ میں تم دونوں کو جان سے مار دوں گا۔ کیا یہی وہ رجعت پسندی ہے جو تم ایک غیر ملک سے لے کر آئے ہو کا نام تہذیب کی ترقی ہے۔ ذلیل کتو! تمہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

شمیم بپھرے ہوئے شیر کی طرح آگے بڑھا اور دونوں پر مکوں اور لاتوں کی بارش کر دی۔ سمیرا برآمدے میں کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر دخل اندازی کی کوئی کوشش نہ کی بلکہ شمیم کو اب اس کے اپنے اصلی رنگ میں دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

انجم اور ندیم زیادہ دیر تک شمیم کا سامنا نہ کر سکے۔ جلد ہی شمیم کے ناقابل برداشت گھونسوں کی بارش نے ان کے ہوش و حواس خطا کر دیئے۔ انجم مار کر کھا کھا کر گرا اور ایک جھاڑی کے پاس گر گیا۔ اور ندیم گھاس کے تختے پر چت لیٹ کر ہانپنے لگا۔ لیکن شمیم نے پھر بھی اسے نہ چھوڑا اور آگے بڑھ کر اس کا گلا گھونٹنے لگا۔ سمیرا نے جو یہ منظر دیکھا تو شمیم کو باز رکھنے کے لئے اس کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ شمیم کو آگے روکتی۔ نازلی لباس تبدیل کر کے اپنی کوٹھڑی سے نکلی اور شمیم کے ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔

چھوڑ دو شمیم بھائی! اتنی ہی کافی ہے ان کے ساتھ۔ انسان ہوئے تو سمجھ جائیں گے۔

لیکن شمیم اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولا۔

نہیں نازلی۔ میں اسے جان سے مار ڈالوں گا۔

نازلی اس کے ہاتھ پکڑ کر پیچھے کھینچنے لگی۔

چھوڑ دو بھیا اسے۔

شمیم نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

نازلی یہ تمہیں پھر تنگ کرے گا۔ میں آج اسے اس کے انجام تک پہنچا دوں گا۔

نازلی نے اس دفعہ
شمیم بھائی! آپ نے
پچھے ہٹتے ہوئے بولی۔
شمیم نے حیرت
ہاں۔ وہ تو
کھڑا ہوا۔
نازلی روہی
نازلی۔
تو پھر ایک
شمیم نے
نازلی کے ہو
ہلتے ہوئے کہا۔
چلو بھیا! اپنے کمرے میں۔
شمیم کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔
نازلی اس کا بازو پکڑ کر اسے کمرے میں لے گئی۔
سمیرا نے بھی اس کے کمرے میں جانا چاہا۔ لیکن جانے کیا سوچ کر وہ دروازے سے باہر ہی ہٹ میں کھڑی ہو کر شمیم اور نازلی کو دیکھنے لگی۔
نازلی نے شمیم کو لے کر کرسی پر بٹھا دیا۔ پھر اس کے شانے دباتے ہوئے کہا۔
بھیا آپ بہت تھک گئے۔ لائیے آپ کو دبا دوں۔
شمیم نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے۔
نہیں نازلی! تم تکلیف نہ کرو۔ مجھے بالکل تھکاوٹ محسوس نہیں ہو رہی۔

شمیم بپھرے ہوئے شیر کی طرح آگے بڑھا اور دو
کر دی۔ سمیرا برآمدے میں کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ ا
کی کوئی کوشش نہ کی بلکہ شمیم کو اب اس کے اپنے اصلی رنگ
پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

انجم اور ندیم زیادہ دیر تک شمیم کا سامنا نہ کر سکے۔ جلد
گھونسوں کی بارش نے ان کے ہوش و حواس خطا کر دیئے۔ ا
ایک جھاڑی کے پاس گر گیا۔ اور ندیم گھاس کے تختے پر چت لیٹ
شمیم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ بڑی تیزی
کہ اس کا گلا گھونٹنے لگ

نازلی تم بولتی کیوں نہیں۔ چپ کیوں ہو۔

اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا۔

ارے تم رو رہی ہو۔

نازلی نے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔

بھیا! آپ جیسا بھائی چھوڑنے کو جی تو نہیں چاہتا۔ لیکن اب میں مجبور ہوں۔
میں آج یہاں سے چلی جاؤں گی۔

کہاں جاؤ گی۔

اپنے گھر۔

نوکری چھوڑ دو گی کیا؟

ہاں بھیا! اب ایسا کرنا ہی پڑے گا۔

تم ٹھیک کہتی ہو نازلی۔ تمہیں اب یہاں نہیں رہنا چاہئے۔

نازلی پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

میں ابھی جا رہی ہوں بھیا۔

شمیم اٹھ کھڑا ہوا۔

ٹھہرو نازلی۔

پھر اس نے اپنے اٹیچی سے سو سو کے پانچ نوٹ نکالے اور نازلی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

یہ لو نازلی تمہارے کسی کام آئیں گے۔

نازلی پیچھے ہٹ گئی۔

نہیں بھیا میں نہیں لوں گی۔

شمیم نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

لے لو نازلی! ایک بھائی اس موقع پر بہن کو جدا کرتے ہوئے اس سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتا۔

نازلی بھاگ کر شمیم سے لپٹ گئی۔

بھیا۔

پھر وہ شمیم کی چھاتی پر سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دروازے کے پاس کھڑی ہوئی سمیرا منہ پھیرے بہن بھائی کی باتیں سن کر آنسو بہاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی اور بستر پر گر کر سسکیاں لے لے

کر رونے لگی۔

شمیم نے نازلی کو جدا کر کے پھر نوٹ اس کی طرف بڑھا کر کہا۔

لے لو نازلی! پگلی بھائی سے لیتے ہوئے شرم کیسی؟

نازلی نے نوٹ لے لئے۔ تھوڑی دیر دیدۂ تر سے شمیم کو دیکھتی رہی۔ پھر واپس مڑ کر ہمیشہ کے لئے کوٹھی سے باہر نکل گئی۔ شمیم کرسی پر بیٹھ کر اپنے آنسو پونچھنے لگا۔

۱۸

شام کا کھانا شمیم نے سب کے ساتھ کھایا۔ لیکن وہ کچھ اور زیادہ اداس اور بجھا بجھا سا تھا۔ تاہم اس نے اپنے رویّے سے علیم اور رفیعہ کو یہ پتہ نہ چلنے دیا کہ اس کا ندیم اور انجم سے جھگڑا ہوا ہے۔ کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے سو رہا۔ رفیعہ اور سمیرا نے کئی بار اس کے کمرے کے چکر لگائے لیکن دروازہ اندر سے بند دیکھ کر واپس لوٹ گئیں۔ نازلی کے جانے کا سب کو پتہ چل چکا تھا۔ لیکن یہ کسی نے نہ بتایا کہ وہ کیوں گئی ہے۔ بہر حال اس کے چلے جانے کا سوائے سمیرا کے کسی نے کوئی اثر نہ لیا۔ اور پھر اس جیسے غریب فرد کا چلا جانا امارت کے ٹھیکیداروں کی نظروں میں وقعت بھی کیا رکھتا ہے۔

دوسرے روز صبح سب لوگ ناشتے کے لئے بیٹھے تو شمیم نہیں تھا۔ رفیعہ نے

اپنا رومال سنبھالتے ہوئے اپنے پاس ہی بیٹھی ہوئی سمیرا کی طرف دیکھ کر کہا۔

سمیرا! شمیم کہاں ہے۔

سمیرا پریشان ہوگئی۔

خانہ جان! وہ ... شاید۔ ٹھہریئے میں انہیں خود دیکھتی ہوں۔

سمیرا نے اٹھ کر اس کا کمرہ دیکھا بستر خالی پڑا تھا۔ وہ غسل خانے کی طرف گئی شمیم وہاں بھی نہیں تھا۔ وہ دوبارہ اس کے کمرے کی طرف آئی اندر داخل ہوتے ہوئے جب شمیم کے بستر کے پاس پہنچی تو دہک سے رہ گئی۔ شمیم کا لکھا ہوا اس کے نام خط تکیہ کے پاس رکھا پڑا تھا۔ سمیرا کانپتے ہاتھوں سے اٹھا کر پڑھنے لگی۔

سمیرا! میں شاید گھر نہ چھوڑتا۔ لیکن تمہاری بے رخی اور کج ادائی۔ بھائی جان کے اکھڑ پن اور ندیم کی اخلاقی کمزوری نے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ تم شاید میرا ساتھ دیتیں تو میں ایسا نہ کرتا۔ ندیم اور انجم تو کیا میں تمہاری خاطر چڑھتے اور بھیانک طوفان سے بھی ٹکرا جاتا۔ لیکن جب تم ہی مجھ سے بیزار ہوگئیں تو میں ایسا کرتا بھی تو کس کے سہارے؟ تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے سمیرا! تم نے مجھے پہلے ہی بتا دیا ہوتا کہ میرے ساتھ تمہاری محبت سطحی ہے جو کبھی نمک کی طرح پانی میں حل ہو کر ختم ہو جائے گی۔ اور

اور پھر پگلی تمہیں بھائی جان سے یہ کہلوانے کی کیا ضرورت تھی کہ تم ندیم سے محبت کرتی ہو اور تم دونوں کی منگنی بھی ہو چکی ہے حالانکہ میں جانتا ہوں تمہاری منگنی نہیں ہوئی۔ تم نے خود مجھے صاف الفاظ میں کہہ دیا ہوتا کہ دولت نے تمہاری آنکھیں چندھیا دی ہیں اور تم نے اپنا راستہ بدل کر ایک نئی منزل کا رُخ اختیار کر لیا ہے۔

مجھے تمہارے دیدۂ نمناک کی قسم میں تمہارے جذبات پامال نہ ہونے دیتا۔ میں ہرگز تمہارے راستے کی رکاوٹ نہ بنتا۔ میں کسی نہ کسی طرح اپنے سینے پر برداشت کی سل رکھ کر تمہارے سے ضرور ہٹ جاتا۔

تم شاید یہ خیال کرو کہ میں بزدل ہوں جو اس طرح بھاگ گیا ہوں لیکن تم نے مجبور کر دیا ہے سمیرا! کیلے اور گلاب کی جھاڑیوں کے پاس تمہارا ندیم سے فری مذاق اس کا تمہارے ہاتھ پر ہاتھ مارنے کے بعد تمہارا ہاتھ پکڑ لینا اور پھر باغیچے میں درخت کے ساتھ بندھی ہوئی تمہاری جُٹیا بڑے پیار سے کھولنا کیا یہ دونوں واقعے میرے جذبات پر کوہ شگاف ضربیں نہ تھیں۔ آخر انسان ہوں۔ دل رکھتا ہوں... تمہاری طرح بت بیدادگر تھوڑا ہی ہوں۔

میں کہاں جا رہا ہوں مجھے خود کوئی علم نہیں۔ میری زندگی کا اب یہ تیسرا دور شروع ہونے والا ہے۔ پہلے دور میں آوارہ اور جوا باز تھا۔ دوسرے دور میں خالو جان کی مہربانی اور تمہاری ہمت افزائی نے مجھے ڈاکٹر بنایا۔ اب تیسرا دور دیکھئے کہ کہاں لے جاتا ہے۔ مجھے اب کوئی فکر فردا نہیں، ماں مر گئی، بہن بھی جدائی کا ایک انمٹ داغ دے گئی پر میں سوچتا کہ شاید میں خودکشی کرنے جا رہا ہوں۔ میں بزدل نہیں میں شوریدہ حالی کے اتھاہ سمندر میں بھی گم ہو کر زندگی کے لئے جُدوجہد کروں گا۔ میں بدلتے حالات کی چیرہ دستیوں کے ہر ساحل پر کھڑے ہو کر بھی اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی کے آنے والے لمحات کو چیخ چیخ کر اپنی طرف پکاروں گا۔

میری دعا ہے خدا تمہیں نئی محبت میں کامیاب کرے اور دولت جس کی تمہیں

خواہش ہے ہمیشہ تمہارے قدم چومے۔ ارادہ تو تھا کہ میری تعلیم کے سلسلے میں خاور جان کا میرے کندھوں پر جو بار احسان ہے اسے اتار کر جاتا۔ خیر مقدر ہی ایسا نہیں چاہتے۔ ایک اور حسرت بھی دل ہی میں رہ گئی ہے کہ ابھی تک میری ملاقات خورشید، پروین اور مجاہد سے نہ ہو سکی۔ حالانکہ وہ میرے چچازاد ہیں میری طرف سے انہیں یہ کہہ کر تسلی دینا کہ شمیم ایک سراب تھا جو خود بخود صحرا کی وسعتوں میں کھو گیا۔ تنویر بچی کو میری یہ حرکت شاق تو گزرے گی لیکن .....

شکستہ دل شمیم

سمیرا خط ختم کرتے ہی شمیم کے بستر پر گر گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے سوتے پھوٹ نکلے۔ اور وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی کھانے کے کمرے میں بھی اس کے رونے کی آواز سنائی دینے لگی۔ سب نے ناشتہ چھوڑ دیا اور شمیم کے کمرے کی جانب بھاگے۔ اندر داخل ہوتے ہوئے سب دم بخود رہ گئے۔ شمیم کمرے میں نہیں تھا۔ اور سمیرا اس کے بستر پر اوندھے منہ لیٹی رو رہی تھی۔

رفیعہ نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شفقت سے پوچھا۔

کیا بات ہے بیٹی! تم رو کیوں رہی ہو شمیم کہاں ہے؟

سمیرا نے سر اٹھا کر پیچھے دیکھا۔ انجم کو اپنے پاس کھڑے دیکھ کر اس نے رفیعہ کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ غصے میں کانپتی ہوئی اٹھی اور انجم کا گریبان پکڑ کر اسے زور جھنجھوڑتے ہوئے صریحاً زور سے چلائی۔

کب میں نے تم سے کہا تھا کہ میں ندیم سے محبت کرتی ہوں۔ کس نے تمہیں کہا کہ میری اور اس کی منگنی ہو چکی ہے۔

سمیرا نے ایک جھٹکے کے ساتھ اس کا گریبان پکڑ کر پھاڑ ڈالا۔

تم ذلیل ہو، کمینے بے غیرت اور بے حمیت ہو۔ تم نے اپنے معصوم بھائی سے دھوکہ کیا ہے۔ تم نے ہی انہیں مجھ سے بدظن کیا ہے۔

وہ اس کا سینہ پیٹنے لگی۔

تم اپنے بھائی کے قاتل ہو۔ تم نے اُسے گھر سے نکلوا کر پھر دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا ہے۔ تم... تم دونوں نے نازلی کے ناموس کو لوٹنے کی کوشش کی لیکن شمیم نے اسے تمہارے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچا لیا اور تم نے خالہ کو یہ کہہ دیا کہ نازلی تو نوکری چھوڑ کر چلی گئی ہے۔

انجم ایک مجرم کی طرح سب کچھ برداشت کرتا رہا۔

سمیرا اس دفعہ اس کا گلا گھونٹتے ہوئے زور سے چلائی۔

میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گی۔ تمہیں جینے کا کوئی حق نہیں۔

رفیعہ نے پریشان ہو کر اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔

سمیرا! پاگل ہو گئی ہو کیا۔

سمیرا نے کلپتے ہوئے کہا۔

خالہ میں پاگل نہیں۔ اس ذلیل سے پوچھو کیا حرکت کی ہے اس نے۔

رفیعہ نے تعجب سے انجم کی طرف دیکھا۔

کیا بات ہے انجم؟

انجم سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

سمیرا نے اس پر نفرت کی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

خالہ جان یہ کیا بتائے گا۔ یہ لیجئے شمیم کا خط۔

رفیعہ دم بخود رہ گئی۔

شمیم کا خط؟

ہاں۔

وہ خود کہاں گیا؟

چلے گئے یہاں سے۔

کہاں چلا گیا! رفیعہ نے بڑی حسرت سے پوچھا۔

میں کیا جانوں۔ یہ خط پڑھ لیجئے۔

رفیعہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ لرزتے ہاتھوں سے خط لے کر پڑھنے لگی۔

خط پڑھنے کے بعد اس کا جسم کپکپانے لگا۔ قریب تھا کہ وہ چکرا کر شمیم کے بستر پر گر جاتی۔ لیکن ندیم اور انجم نے اسے سنبھال لیا اور رفیعہ کو اس کے کمرے میں لے گئے سمیرا بھی باہر نکلی اور کوئی آخری فیصلہ کرتی ہوئی اپنے ابا ساجد اور تنویر کو تار دینے آئی۔

شمیم کی جدائی نے سمیرا کے دل پر کچھ ایسا اثر کیا کہ وہ چارپائی سے لگ گئی۔ رفیعہ لاکھ سمجھاتی لیکن وہ تھی کہ ہر وقت رو رو کر ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔ دو دن ساجد بھی

پہنچ گئے۔ پورے واقعات سننے کے بعد انہوں نے انجم پر جرح و توبیخ کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ کچھ کھڑا سنتا رہا۔

ساجد پوری رات سمیرا کو تسلی دیتے رہے۔ تیسرے روز صبح سویرے تنویر بھی دونوں لڑکیوں خورشید اور پروین کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ رفیعہ اور ساجد اس سمیرا کے کمرے میں اسے ناشتہ کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ لیکن وہ کسی کی پرواہ کئے بغیر پرلیٹی خلاؤں میں گھور رہی تھی۔

تنویر کو اپنے کمرے میں دیکھتے ہی سمیرا اٹھ کھڑی ہوئی اور اس سے لپٹ کر سسکیاں بھرتے رونے لگی۔ بڑا دل افگار منظر تھا تنویر اس کی حالت دیکھ کر دنگ رہ گئی پاس ہی خورشید اور پروین بھی کھڑی دیدہ حیرت سے اُسے دیکھ رہی تھیں تنویر نے بڑے پیار سے چمکارتے ہوئے کہا۔

کیا بات ہے بیٹی کچھ منہ سے تو بولو۔

سمیرا آنسو پونچھتے ہوئے پیچھے ہٹی اور اپنے تکیئے کے نیچے سے شمیم کا خط نکال کر تنویر کو دے دیا۔

خط پڑھنے کے بعد تنویر، خورشید اور پروین کے ہوش خطا ہو گئے۔ تنویر نے بڑے پیار سے کہا۔

سمیرا! کیا ندیم کے ساتھ تمہارے یہ دونوں واقعے درست ہیں؟

سمیرا نے روہانسی آواز میں کہا۔

چچی جان! وہ غلط سمجھے تھے۔ ورنہ میں تو ندیم کو اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔ پھر

اس نے دونوں واقعے اور انجم کا شمیم سے جھگڑا بھی تفصیل سے سنا ڈالا۔

اور یہ دوسرے الفاظ کیا تم نے انجم سے کہے تھے؟

چچی! یہ سب کچھ انجم بھائی اپنی طرف سے کہتے رہے ہیں۔

تنویر غصے میں بل کھانے لگی۔

لیکن کیوں؟

وہ شمیم کے بجائے ندیم کی طرف داری کرتے رہے۔

تم نے خود شمیم کو سب کچھ بتا دیا ہوتا۔

چچی! انجم نے کچھ اس قدر جلدی انہیں بدظن کر کے یہاں سے نکال دیا، مجھے ان سے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ ملا۔

تنویر اس بار رفیعہ سے مخاطب ہوئی۔

رفیعہ انجم کہاں ہے۔؟

رفیعہ نے افسردگی سے کہا۔

اپنے کمرے میں ہے۔

ذرا اسے میرے پاس تو بھیج دو۔

رفیعہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔

سمیرا، خورشید اور پروین کے ساتھ اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔ تنویر ان کے سامنے کے قریب کرسی پر جم گئی۔

تھوڑی دیر بعد انجم کمرے میں داخل ہوا اور تنویر کو سلام کرتے ہوئے سامنے

یب ہی بیٹھ گیا۔

کمرہ کچھ دیر گہری خاموشی میں ڈوبا رہا پھر تنویر کی آواز گونجی۔

انجم! شمیم کہاں ہے!

اس سوال پر انجم کا سانس تلے کا تلے اور اوپر کا اوپر رہ گیا۔ بدحواس ہو کر کہا۔

جی... وہ تو۔

رک کیوں گئے۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے۔ تنویر کی طبیعت میں تمازت

آ رہی تھی۔

وہ چلا گیا یہاں سے۔

تنویر کے لہجے میں تناؤ پیدا ہو گیا۔

کہاں؟

بتا کر نہیں گیا۔

تم نے اسے مارا کیوں؟ وہ تنگ طبعی پر اتر آئی۔

انجم نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

غلطی ہو گئی ہے چچی جان۔ معاف کر دیجئے۔

تنویر غصے میں بپھر گئی۔

تم نے شمیم سے یہ کیوں کہا کہ سمیرا اور ندیم کی منگنی ہو چکی ہے اور دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔

انجم نے کوئی جواب نہ دیا۔

تنویر برس پڑی اور انجم کو بے نقط سنانے لگی۔

تم نے بڑی کمینگی کا ثبوت دیا ہے انجم۔ تم نے ندیم کا ساتھ دیتے ہوئے اپنے بھائی کے جذبات کا خیال نہیں کیا۔ اس بیچارے نے پہلے ہی کون سا سکھ دیکھا تھا جو تم نے اسے پھر دربدر کی ٹھوکر کھانے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔

تنویر کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔

وہ بے چارہ پہلے ہی اپنی بیمار ماں اور معصوم بہن کو لئے جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ تمہیں تو ماں اور بہن کے مرنے کا احساس تک نہیں۔ لیکن اس کے لئے یہ دونوں غم ہی ناقابل برداشت تھے۔ مجھے تم سے نفرت ہو چکی ہے انجم۔ اٹھ جاؤ یہاں سے میں تمہاری شکل دیکھنا بھی اب پسند نہ کروں گی تم... تم نے پھر شمیم کو ہم سے جدا کر دیا ہے۔ تم سخت کٹھور ہو انجم چلے جاؤ یہاں سے

سمیرا، خورشید اور پروین رونے لگی تھیں۔ ساجد کی آنکھیں بھی نمناک ہوگئی۔

انجم اپنی جگہ سے اٹھا اور تنویر کے پاؤں پر گر کر ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

معاف کر دیجئے چچی جان! مجھ سے غلطی ہوگئی۔

تنویر نے اپنے آنسو پونچھ کر کہا۔

مجھ سے معافی کیوں مانگتے ہو۔ اگر اپنی غلطیوں کا احساس ہو چکا ہے تو شمیم کو ڈھونڈ کر لاؤ۔ میں آج ہی جمشید، سہیل اور مجاہد کو بھی خط لکھتی ہوں کہ وہ شمیم کی تلاش میں دن رات ایک کر دیں۔

انجم اٹھا اور ایک عزم سے کہا۔

چچی! میں جب تک اپنے بھائی کو تلاش نہ کر لوں گا۔ چین سے نہ بیٹھوں گا۔

انجم کمرے سے باہر نکل گیا۔

تنویر، پروین اور خورشید اسی روز سمیرا کو ساتھ لے کر سندھ چلی گئیں۔ ساجد اپنی ڈیوٹی پر روانہ ہو گئے۔

۱۹

ایک سُست رو، اداس اور بجھی بجھی سی شام عصمت اپنے کلینک میں ایک مریضہ کا معائنہ کرنے میں مصروف تھی کہ شمیم کلینک میں داخل ہوا۔ عصمت اسے دیکھ کر خوشی سے پھول کی طرح کھل اٹھی۔ اور اس کے چہرے پر کسی انجانی خوشی کے رنگ برسنے لگے۔

عصمت کو مصروف دیکھ کر شمیم کلینک کے پچھلے کمرے میں بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ مریضہ کا معائنہ کرنے کے بعد عصمت بھی اس کی طرف لپکی۔ وہ اس وقت بے حد اداس اور غمگین دکھائی دے رہا تھا۔ عصمت اسے اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گئی۔ لیکن فوراً آگے بڑھی اور کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

شمیم کیا بات ہے اداس کیوں ہو۔؟

شمیم خوبصورتی سے ٹال گیا۔

نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس ذرا تھکاوٹ سی ہے۔

رفیعہ خالہ اور سمیرا کیسی ہیں۔

بالکل ٹھیک ہیں۔

یہاں کب آئے۔

آج ہی۔

سیدھے میرے پاس ہی آ رہے ہو؟

ہاں۔

سچ۔

پہلے کبھی تمہارے سامنے جھوٹ بھی بولا ہے۔؟

شمیم کے لہجے میں کچھ ایسی سوختگی اور درد تھا کہ عصمت متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور پھر اس نے جو شمیم کی آنکھوں میں غور سے جھانکا۔ تو دو آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے چھپ چھپ کر رقص کر رہے تھے۔ عصمت مضطرب اور بے چین ہو کر بڑی ہمدردی سے شمیم کے سراپا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

شمیم! اُلجھے اُلجھے سے کیوں ہو؟

شمیم خاموشی سے چھت کی طرف دیکھتا رہا۔

عصمت پھر بولی۔

کیا جھگڑا ہوا ہے کسی کے ساتھ۔

شمیم نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔

عصمت اور بے چین ہوگئی۔ اور اس کا شانہ جھنجھوڑتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔

شمیمی!

شمیم چونکا۔

کیا ہے؟

میں نے کیا پوچھا ہے۔

شمیم کی آنکھوں میں آنسو چھلک گئے۔ منہ دوسری طرف کر کے ضبط کرنے لگا۔

عصمت کا جیسے دل پھٹ گیا۔ اس کا چہرہ پکڑ کر اپنی طرف کرتے ہوئے بولی۔

شمیم! رو رہے ہو؟ تم نے تو کبھی بد سے بدتر حالات کے سامنے بھی گھٹنے نہ ٹیکے تھے۔ کس بات نے تمہیں آنسو بہانے پر مجبور کر دیا ہے۔

شمیم حسرت سے عصمت کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

عصمت نے اٹکتی ہوئی آواز سے کہا۔

شمیم! خدارا کچھ تو بولو۔ اس طرح خاموشی سے مجھے گھورتے رہے تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔

شمیم نے تھوڑی دیر پھر خاموش رہنے کے بعد شروع سے لے کر آخر تک بیگم کی بے رخی اور انجم کے ساتھ جھگڑے کے پورے واقعات سنا ڈالے۔

عصمت کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

شمیم! میرا ایسی تو نہ تھی۔ خیر بہت برا کیا اس نے۔ مجھے امید تک بھی نہ تھی کہ دولت کی آنکھیں چندھیا دے گی۔

عصمت کچھ رک کر بولی۔

اٹھو چلیں!

شمیم نے حیرت سے پوچھا۔

کہاں؟

عصمت کے خوب صورت ہونٹوں پر ہمدردی میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ تھی۔

گھر اور کہاں!

نہیں عصمت میں ... میں اب

کیا میں اب؟

شمیم کی آواز میں جلن تھی۔

سوچتا ہوں کہیں دور چلا جاؤں۔ جہاں غم تو کیا مجھے اپنی ہستی تک کا احساس نہ ہو۔

عصمت گھبرا گئی۔

نہیں شمیم! میں تمہیں کہیں نہ جانے دوں گی۔ سچ امی پہلے ہی آپ کو ہر وقت یاد کرتی رہتی ہیں۔ آپ کے اب گھر چلنے سے انہیں بے حد خوشی ہوگی۔

عصمت! میں پہلے ہی کافی عرصہ تمہارے لئے باعث تکلیف رہا ہوں۔ میں پھر تمہارے سر درد نہیں بننا چاہتا۔

عصمت نے اس کے منہ پر اپنا گورا گورا گداز اور خوب صورت ہاتھ رکھ دیا۔

شمیم ایسی باتیں نہ کرو۔ مجھے دکھ ہوتا ہے۔ اب تم ہمیشہ کے لئے میرے پاس رہو گے۔ میں تمہیں کہیں نہ جانے دوں گی۔ چلو اُٹھو چلیں۔

شمیم اسی طرح پڑا رہا۔

عصمت نے اس کے دونوں بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے بڑے قرب انگیز لہجے میں کہا۔ اٹھو نا۔

شمیم اُٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں باہر آئے۔ عالیہ باہر بڑے کمرے میں بیٹھی تھی۔ شمیم کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور حیرت سے بولی۔

شمیم بھائی کب آئے آپ؟

ابھی ابھی آیا ہوں۔ تم شاید کہیں باہر گئی تھیں۔

جی ہاں۔ میں ابھی ابھی آئی ہوں۔

فوزیہ کہاں ہے؟

اس کی آج چھٹی ہے۔

سناؤ کیسی ہو؟

بس ٹھیک ہوں بھیا۔

اس دفعہ عصمت نے عالیہ کو مخاطب کیا۔

عالیہ میں گھر جا رہی ہوں۔ کلینک سے باہر آئے۔ اور کار دونوں کو لئے کچہری روڈ پر عصمت کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئی۔

عصمت کی امی عطیہ واقعی شمیم سے کچھ اس طرح ملیں جیسے کوئی بیقرار ماں کافی

ے سے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے سے لپٹ لپٹ کر ملتی ہے۔ اُس کے اس سلوک شمیم سارے غم بھول گیا۔ عصمت نے اپنے کمرے سے ملحق ایک کمرہ شمیم کے لئے خالی کرا ڈالا۔ ہی دن میں اس نے فرنیچر اور طرح طرح کے دوسرے سامان سے شمیم کا کمرہ دلہن کی ح سجا دیا۔ شمیم کے منع کرنے کے باوجود عصمت نے اس کے لئے بیسیوں جوڑے ر گرم سوٹ بنوڈالے۔

شمیم بھی بے کار بیٹھنے والا نہ تھا۔ چند دنوں کی دوڑ دھوپ کے بعد وہ شہر کے سول سپتال میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ دن اب پھر خوشگوار ہو کر گزرنے لگے۔ شمیم دن کو ہسپتال چلا جاتا عصمت کلینک بیٹھی رہتی۔ اس کی کار اب شمیم کے تصرف رہتی۔ وہ اسے صبح سویرے کلینک چھوڑ کر ہسپتال چلا جاتا۔ اور آتی دفعہ اسے کلینک سے لے جاتا۔ واپسی پر دونوں کافی رات گئے تک اکٹھے بیٹھ کر گپ لگاتے۔ اور یوں شمیم ایک بار پھر بحر غم کے تپتے ہوئے ساحل سے دور جا کھڑا ہوا۔

اسی طرح کئی ہفتے گزر گئے۔ عصمت اب شمیم سے قریب ہوتے ہوتے اس کا دامن بن گئی تھی۔ شمیم کی اب چند لمحوں کی جدائی بھی اس کے لئے ناقابل برداشت ہوتی کلینک میں بھی وہ ہر وقت اسی کے خیالوں میں کھوئی رہتی تھی۔

ایک روز ناشتے کے بعد شمیم اپنے کمرے میں لباس تبدیل کر رہا تھا کہ عطیہ اندر داخل ہوئی۔ شمیم اس کی طرف پشت کئے آئینے کے سامنے کھڑا ٹائی کی گرہ لگا رہا تھا کہ اس کی شفقت آمیز آواز سے وہ چونک پڑا۔

ہسپتال جا رہے ہو بیٹا؟

شمیم نے واپس مڑتے ہوتے کہا۔

ہاں امی ٹائم ہوگیا ہے۔

عطیہ اس کے بستر کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔

شمیم! وہ۔۔۔ میں۔۔۔

امی کہیے آپ رک کیوں گئیں۔ شمیم اس کے قریب آبیٹھا۔

بیٹا! تم جانتے ہو۔ میرا سب کچھ عصمت ہی ہے۔ میری زندگی کا کیا اعتبار ہوتا ہے بہت جلد اس کی شادی کردوں۔

شمیم نے بیگانگی سے کہا۔

بڑا اچھا خیال ہے امی۔

میں تمہارا ارادہ جاننا چاہتی ہوں بیٹا۔

شمیم نے سر جھکا لیا۔

امی! میں آپ کے کسی بھی فیصلہ کے آگے سر نہ اٹھاؤں گا۔

اتنا کہتے ہی شمیم اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اور عطیہ مسکراتی ہوئی حسین خیالوں میں کھو گئی۔

شمیم سیدھا عصمت کے کمرے میں داخل ہوا وہ ایک بے حد شوخ رنگ کی ساڑھی اور بلوز پہنے کھڑکی میں سے باہر گھور رہی تھی۔ شمیم دبے پاؤں آگے بڑھا اور پیچھے سے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ عصمت کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

اوئی اللہ چھوڑیئے نا۔

شمیم نے اس کا رخ اپنی طرف کرتے ہوئے چھوڑ دیا۔

عصمت اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

آپ تیار ہوگئے۔

شمیم نے مسکرا کر کہا۔

ہاں۔ عصمت تمہیں ایک خوشخبری سناؤں۔

سنائیے۔

تمہاری شادی ہو رہی ہے بس بالکل عنقریب۔

عصمت پریشان ہوگئی۔

شمیم نے شرارت آمیز تبسم سے پوچھا۔

ارے گھبرا کیوں گئیں۔ پہلے یہ تو پوچھو کس سے۔

عصمت خاموش ہی رہی۔

شمیم ضد کرنے لگا۔

بھئی اگر تم نے نہ پوچھا تو بس میں ناراض۔

عصمت نے ملتجی نگاہوں سے دیکھتے ہوتے کہا۔

خدارا ناراضگی کا نام نہ لیا کریں خود ہی بتا دیجئے نا کس سے ہو رہی ہے۔

شمیم نے کمال شوخی سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

ڈاکٹر شمیم سے۔

عصمت لجا گئی اور اس کا گداز جسم شرم سے پسینوں میں ڈوب کر کپکپا اٹھا۔

شمیم نے اسے شانوں سے پکڑ کر اپنے ساتھ لپٹا لیا عصمت کی طرف سے کوئی اعتراض نہ ہوا۔ اور بڑی دل پذیر ادا سے اپنا سر اس کے سینے سے ٹکا دیا۔ شمیم اُس کے سیاہ بال چومتے ہوئے کہنے لگا۔

عصمت چلو چلیں میرا آج اپریشن ڈے بھی ہے۔

چلئے۔ عصمت نے اس سے لپٹے ہی لپٹے کہا۔

دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کمرے سے باہر نکل گئے۔

ایک ہفتہ بعد شمیم اور عصمت کی شادی ہوگئی۔ عصمت نے اپنا کلینک بنک بیلنس اور کوٹھی تک شمیم کے نام کرادی۔ عطیہ ساری جائیداد شمیم کے نام ہو جانے کے باوجود خوش تھی کہ اس کی بیٹی کو اس کی پسند کا شوہر مل گیا ہے۔ عصمت کی خوشیوں کا بھی کوئی کنارہ نہ تھا۔ اسے امید تک بھی نہ تھی کہ محبت کی وہ منزل جو اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی یکایک اس کے سامنے نمودار ہو کر اس سے لپٹ جائے گی۔

اور!

روز و شب کا قافلہ آگے بڑھتا رہا۔ شمیم اور عصمت کو شوہر اور بیوی کی حیثیت سے رہتے ہوئے چھ ماہ گزر گئے ایک روز اپنے کمرے سے لباس تبدیل کرنے کے بعد بھاگتا ہوا نکلا اور ڈرائینگ روم کی طرف جاتے ہوئے چلایا۔

عصمت! جلدی لاؤ ناشتہ۔ میں ہسپتال سے لیٹ ہو رہا ہوں۔

کھانے کے کمرے سے آواز آئی۔

آپ آئیے نا۔ ناشتہ تو میں نے تیار کر رکھا ہے۔

شمیم کھانے کے کمرے میں داخل ہوا عصمت ناشتے کے برتن جما رہی تھی۔ شمیم اس کے قریب پہنچ کر اسے گہری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ عصمت مسکرانے لگی۔ ایک کرسی پکڑ کر آگے سرکائی اور شمیم کو شانوں سے پکڑ کر اس پر بٹھا دیا اس کے پاس ہی کھڑی ہوگئی پھر۔

پھر

اپنا ایک بازو اس کی گردن کے گرد حائل کر دیا اور دوسرے سے اس کے لئے خاگینے کے ٹکڑے کاٹنے لگی۔

شمیم کو کوئی شرارت سوجھی فوراً اس کا گداز بازو پکڑ لیا۔

عصمت نے چھری میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

چھوڑیئے نا لیٹ ہو جائیں گے۔

لیکن شمیم نے مسکراتے ہوئے اسے اپنی گود میں سمیٹ لیا۔

عصمت نہ تڑپی نہ کسمسائی کچھ کہے بغیر اس کی گود میں سمٹ گئی۔ جلد ہی دونوں کے بازو ایک دوسرے کی گردن کے گرد حائل ہوگئے پھر دونوں کے چہرے ایک دوسرے کی طرف بڑھے تشنہ لب پھڑپھڑاتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب آئے اور

اور.....

ناشتہ کے بعد شمیم جب عصمت کو لے کر اس کے کلینک سے ابھی کچھ گز دور ہی

تھا کہ کار کے شیشے میں سے اس کی نگاہ کلینک کے سامنے کھڑے تین مرتے تانگے اور ہٹے کٹے جوانوں پر پڑی شمیم انہیں دیکھ کر پریشان سا ہو گیا۔ یہ وہی تھے جن سے ایک دفعہ شروع شروع میں اس نے سمیرا کی عصمت بچائی تھی۔ ان کے ساتھ ایک برقعہ پوش خاتون بھی تھی اور وہ سب کلینک کے بڑے گیٹ کے پاس کھڑے عالیہ سے گفتگو کر رہے تھے۔

شمیم جب ان کے قریب کار روک کر نیچے اترا تو اسے دیکھتے ہی وہ کچھ گھبرا گئے اور برقعہ پوش خاتون کو ساتھ لے کر تینوں آگے بڑھ گئے شمیم فوراً عالیہ کی طرف بڑھا اور ذرا سختی سے پوچھا۔

عالیہ کون تھے یہ۔

عالیہ نے معصومیت سے جواب دیا۔

مجھے تو کچھ علم نہیں بھیا۔

کیا پوچھ رہے تھے تم سے۔

عالیہ نے روانی سے کہا۔

ان کے ساتھ کوئی بیمار عورت تھی وہ پوچھ رہے تھے لیڈی ڈاکٹر ہیں یا نہیں

پھر تم نے کیا کہا۔

میں نے کہا ابھی تک نہیں آئیں۔

بہت اچھا کیا تم نے۔

کیا آواز دے کر انہیں اب بلا لوں۔

نہیں عالیہ جانے دو۔ وہ اچھے آدمی نہیں ہیں۔

شمیم پیچھے ہٹا اور عصمت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اچھا عصمت میں چلا۔

عصمت کو اچانک جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ اپنا پرس کھولتے ہوئے کہا۔

ٹھہریے مجھے آپ کی جیب میں روپے ڈالنا تو یاد ہی نہیں رہے ذرا اپنا بٹوہ نکالیے۔

شمیم نے بٹوہ نکال کر اسے تھما دیا عصمت نے اپنے پرس سے دس دس کے کئی نوٹ نکال کر اس کے بٹوے میں رکھنے کے بعد خود آگے بڑھ کر بٹوہ شمیم کے کوٹ کی جیب میں ڈال دیا۔

عصمت ہاتھ ہوا میں لہراتی ہوئی کلینک میں داخل ہو گئی اور شمیم کار میں بیٹھ کر سول ہسپتال کی طرف بڑھنے لگا۔

۲۰

ایک روز دوپہر سے کچھ قبل شمیم اپنے وارڈ کا راؤنڈ کر رہا تھا۔ ایک ایک مریض کے پاس جا کر وہ اس کی احوال پرسی کرتا پھر ہمدردی کی چند باتیں کرنے کے بعد آگے بڑھ جاتا۔ مریض اس کے سلوک سے کچھ اس طرح متاثر ہوتے جیسے اس دنیا میں سب کچھ ان کا وہی ہو۔

اچانک اس کے وارڈ کی نرس ثریا بھاگتی ہوئی آئی اور ہکلاتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر جلدی کیجئے بہت سیریس کیس آیا ہے۔

کہاں ہے؟ شمیم نے بے چین ہو کر کہا۔

کمرہ نمبر ۲ کے بیڈ نمبر ۱۶ پر

زخمی ہے کیا؟

ہاں ایک نوجوان لڑکی ہے۔ اس کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ بالکل بے ہوش ہے۔ جلدی کیجئے ڈاکٹر ورنہ شمیم بدحواس ہو کر تقریباً بھاگتا ہوا۔ کمرہ نمبر ۲ میں داخل ہوا۔ لیکن اندر ہوتے کے بعد ایک ایسا منظر سامنے آیا۔ کہ اس کا دل پھٹ گیا۔ اور بیکبارگی بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ اس کے سامنے سمیرا بستر پر بے ہوش پڑی تھی اور قریب ہی مجاہد خورشید اور پروین چہروں پر موت کی سی افسردگی لئے کھڑے تھے۔

شمیم نے چونکہ اس سے قبل ان تینوں کو دیکھا ہوا نہ تھا لہذا انہیں دیکھ کر اس نے کسی قسم کے تعجب کا اظہار نہ کیا۔ لیکن سمیرا کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا۔ یاد کہنہ پھر ناسور بن گئی۔ کافی دیر تک وہ نہ جانے کن خیالوں میں الجھا ہوا سمیرا کو گھورتا رہا۔ لیکن ثریا برداشت نہ کر سکی فوراً اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر!

شمیم فوراً سنبھل گیا کافی دیر تک سمیرا کا معائنہ کرنے کے بعد اس کی پیشانی اور ٹانگوں پر پٹیاں باندھ دیں ثریا سے کہہ کر اس نے خورشید اور پروین کے لئے کرسیاں نکالیں اور مجاہد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا آپ ذرا میرے ساتھ آئیے۔

ثریا سمیرا کے پاس ہی کھڑی رہی خورشید اور پروین کرسیاں کھینچ کر مسہری کے قریب بیٹھ گئے اور شمیم، مجاہد کو لے کر اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔

دونوں کچھ دیر خاموش رہے آخر شمیم نے مخاطب کرنے میں پہل کی۔

آپ کا نام کیا ہے۔

مجاہد۔ اس نے گھبراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

مجاہد! شمیم نے چونک کر نام دہرایا۔

جی ہاں۔ آپ پریشان کیوں ہوگئے۔

جی نہیں ۔۔۔ وہ آپ کی بہن نہیں کیا؟

جی ہاں۔

زخمی کیسے ہوگئیں۔

ہم آج چاروں بہن بھائی سندھ سے گھر واپس لوٹ رہے تھے کہ لاہور سے آگے کار ڈرائیو کرنا شروع کی اس بیچاری کے ساتھ ایک حادثہ پیش آچکا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ کچھ پریشان اور کھوئی کھوئی رہتی ہے۔ راستے میں ڈرائیو کرتے ہوئے وہ نہ جانے کن خیالوں میں غرق تھی کہ کار سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ایک ٹرک سے ٹکرا گئی۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ کار کی رفتار کم تھی ورنہ ہم میں سے کوئی بھی نہ بچتا۔

کار کا زیادہ نقصان تو نہیں ہوا۔

جی نہیں۔ کار تو بالکل بچ گئی لیکن اس کا سر اسٹیرنگ سے بری طرح ٹکرایا اور وہ وہیں بے ہوش ہوگئی۔

شمیم نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

کیا نام ہے آپ کی بہن کا۔

سمیرا۔

مجاہد نے پھر ذرا ملتجی لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر وہ ٹھیک ہوجائے گی نا۔ میں اس کا علاج گھر پر کراتا لیکن میں چاہتا

کہ اس کے ایکسیڈنٹ کی کسی کو اطلاع نہ ہو وہ خاندان میں بے حد عزیز ہے۔ اس کے زخمی ہونے کی خبر سن کر سب کو پریشانی ہوگی۔ میں چاہتا ہوں وہ ٹھیک بھی ہو جائے اور ہم تینوں بہن بھائیوں کے علاوہ کسی کو پتہ بھی نہ چلنے پائے۔

تو کیا آپ چاروں بہن بھائی ہی گھر آرہے تھے۔

ہاں۔ ہمارا باقی خاندان سندھ میں ہے۔

آپ فکر نہ کیجیے وہ بہت جلد ٹھیک ہوجائے گی۔ ان کو سکون اور تنہائی کی ضرورت ہے۔ پیشانی کی چوٹ نے ان کی بینائی پر اثر کیا ہے اگر احتیاط سے کام نہ لیا گیا تو ان کی بینائی ہمیشہ کے لئے ختم ہوجانے کا خطرہ ہے۔

مجاہد کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

ڈاکٹر۔ میں اس کے علاج کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہوں۔ خدا کے لئے اسے کسی طریقے سے بچا لیجیے شمیم نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

گھبرائیے نہیں۔ میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔

شمیم کے تسلی دینے پر مجاہد کچھ سنبھل کر بولا۔

ڈاکٹر آپ کا نام۔

میرا نام اشرف ہے۔ شمیم نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

یہیں کے رہنے والے ہیں۔

جی ہاں۔

شمیم نے بات آگے بڑھانے کی غرض سے نیا موضوع چھیڑا۔

کیا آپ کا کوئی رشتہ دار ڈاکٹر بھی ہے۔

جی ہاں۔

میرے ساتھ ایک ڈاکٹر تھے۔ ان کی شکل بالکل آپ سے مشابہت رکھتی ہے۔

مجاہد نے کسی قدر تجسس سے پوچھا۔

کیا نام تھا اُن کا۔

اس کا نام شمیم تھا۔ وہ میرے ساتھ کچھ عرصہ میو ہسپتال لاہور میں رہا ہے۔ اس کے ساتھ اس کا ایک ڈاکٹر بھائی بھی تھا جس کا نام شاید انجم تھا۔

مجاہد نے بیتاب ہو کر کہا۔

ہاں ہاں ڈاکٹر! وہ دونوں میرے چچا زاد بھائی ہیں کیا آپ بتا سکتے ہیں شمیم ان دنوں کہاں ہے۔

نہیں۔ آج کل تو پتہ نہیں وہ کہاں۔

ڈاکٹر! شمیم نے ہی سمیرا کو اس حالت تک پہنچایا ہے۔

شمیم نے مصنوعی تعجب کا اظہار کیا۔

وہ کیسے؟

جواب میں مجاہد نے پورے واقعات سنا ڈالے اور دونوں واقعات کی اصلیت بھی کھول کر سنا دی جن کی وجہ سے شمیم سمیرا سے بدظن ہو گیا تھا۔ بعد میں اس نے ایک ایک کر کے انجم کے جھوٹوں سے بھی پردہ ہٹا دیا۔

واقعات کی اصلیت جاننے کے بعد شمیم کے سارے شکوک دور ہو گئے۔ وہ اب

سمیرا کو معصوم بے گناہ اور اپنے آپ کو ناقابل معافی مجرم سمجھنے لگا۔ اس کے ضمیر نے اپنے بزدل من اس کے دل میں چبھو کر اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔

تم... تم سمیرا کے جذبات کے قاتل ہو اس نے تمہیں دل کی عمیق گہرائیوں سے چاہا ہے تم نے اسے کیا دیا۔ غم اور جدائی کے مہیب سائے۔ تف ہے تمہاری اس زندگی پر جس نے اسے جدائی کے دہکتے انگاروں پر لوٹا دیا۔ گھر چھوڑنے سے قبل تم نے اس سے ان دونوں واقعات کی جواب طلبی تو کی ہوتی۔ وہ ہر روز تمہیں سنانے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن تم ہر بات کا جواب نفرت سے دیا اس نے تم سے قریب ہونا چاہا تم دور بھاگے۔ تم نے صرف اپنے جذبات کا خیال کیا اور اس کی آرزوؤں کو پامال کر دیا۔

آخر کیوں۔

اس لیے کہ وہ عورت ہے۔ جو ازل سے مظلوم چلی آتی ہے تم مجرم ہو شمیم! ناقابل معافی مجرم اب بھی موقع ہے اس سے اپنے سلوک کی معافی مانگ کر اپنے گناہوں کا تلافی کر ڈالو تمہاری جدائی میں وہ تمہاری حسین یادوں کو لیے کر دو سے کیسے دن گزار رہی ہے۔

اور تم۔

تم بہت جلدی کسی کے گداز بازوؤں کا سہارا لے کر رنگین بہاروں میں کھو گئے اور اسے تم نے خزاں کے کسی پتے کی طرح غم کے صحرا میں ٹھوکریں کھانے کیلئے اکیلا چھوڑ دیا اس نے تم سے تمہاری بے رخی کی وجہ پوچھی۔ تم نے اُسے دھتکار

دیا۔ اس نے تمہارا غم جاننا چاہا تم نے خاموشی سادھ لی۔

تم ہر طرف سے گنہگار ہو۔ شمیم تمہاری محبت کا محور خود چل کر تمہارے پاس پہنچ گیا ہے۔ اب بھی وقت ہے اٹھو اور آگے بڑھ کر اُسے اپنے گلے لگا لو۔ اس سے اپنی زیادتیوں کی معافی مانگ کر اس کے سارے غم دھو ڈالو۔ اٹھو سوچتے کیا ہو۔ ایسے موقعے بار بار نہیں لگتے پچھتاؤ گے۔ شمیم۔ تم ایک روز ضرور پچھتاؤ گے۔

لیکن اس کے دل کے نہاں خانوں سے اس کا جواب بھی سنائی دیا۔

نہیں۔ اب ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ تم عصمت کی امانت ہو تم اسے چھوڑ کر اگر سمیرا کے ساتھ چلے گئے تو وہ جی نہ سکے گی اس کی محبت لازوال ہے۔ وہ خودکشی کر لے گی۔ تم جذبات کے قاتل سے اصل قاتل محبت کی شفاف پیشانی پر بدنما داغ بن جاؤ گے۔ محبت نے تمہیں اب ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔ کوئی نیا راستہ اختیار کرنے کے بجائے اپنی اسی راہ پر آگے بڑھتے جاؤ۔ جاؤ شاید کبھی منزل تمہارے سامنے آنو دار ہو۔

مجاہد کی آواز سے اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

کیا سوچ رہے ہو ڈاکٹر۔

شمیم نے اپنے سر کو ایک جھٹکا دیا۔

کچھ بھی نہیں۔ میں ذرا اونگھنے لگا تھا۔

آپ بیٹھئے۔ میں پھر چلتا ہوں۔

ہاں۔ آپ جائیے اپنی بہن کے پاس میں نے بھی ابھی چند مریضوں کا معائنہ

کرنا ہے۔

مجاہد سمیرا کے کمرے میں چلا گیا اور وہ بے چینی سے وارڈ میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ شمیم بڑی تندہی سے سمیرا کا علاج کرتا رہا۔ خورشید اور پروین سمیرا کی موجودگی میں ن سے بات کرنے کی کوشش کرتیں تو وہ انہیں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش کر دیتا دنوں اس نے سمیرا سے اپنا آپ چھپائے رکھا۔ تاہم وہ مغموم اور اداس رہنے لگا عصمت نے لاکھ کریدا لیکن وہ اسے اپنے ساتھ لپٹا کر ٹال جاتا عصمت بھی اس کی بت دیکھ کر خاموش ہو رہتی۔

آج رات نو بجے سمیرا کی آنکھوں کی پٹی کھلنی تھی شام سے کچھ قبل شمیم اپنے وارڈ کے آفس میں کچھ پرسکون بیٹھا تھا اس کے خیال کے مطابق سمیرا کی آنکھوں ٹھیک ہو جانی تھیں۔ اور وہ سوچ رہا تھا کس طرح وہ سمیرا کا سامنا کر سکے گا کہ پروین اندر داخل ہوئی اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر! ذرا آپ کو میری باجی بلا رہی ہیں۔

شمیم نے کچھ سوچا پھر پروین کے ساتھ ہو لیا۔

سمیرا کا چہرہ آج کچھ خوشگوار تھا۔ خورشید اس کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی اور مجاہد رے کے ایک کونے میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ شمیم سمیرا کی چارپائی کے قریب جا لڑا خورشید سمیرا کو جھنجھوڑ کر بولی۔

سمیرا! ڈاکٹر آ گئے۔

سمیرا نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

کہاں ہیں۔

یہ تمہاری چارپائی کے قریب کھڑے ہیں۔

سمیرا نے ہلکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیرتے کہا۔

ڈاکٹر! مجھے محسوس ہو رہا ہے۔ میں ٹھیک ہو چکی ہوں آپ نے جس تندہی سے میرا علاج کیا ہے۔ میں اس کی مشکور ہوں میں آپ کی اس محنت اور مساعی جمیلہ کا معاوضہ دینا چاہتی ہوں آپ جو کچھ منہ سے نکالیں گے وہی ملے گا آپ کو۔

شمیم بے خیالی میں بولا۔

آپ کو میرا مشکور ہونے اور کسی قسم کا معاوضہ دینے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے اللہ کا احسان ہے آپ کی آنکھیں ٹھیک ہو گئی ہیں۔

سمیرا آواز پہچان گئی۔ بڑے تجسس سے پوچھا۔

ڈاکٹر! کون ہیں آپ۔

شمیم بدحواس ہو گیا۔

جی... جی میں...

سمیرا کرب انگیز لہجے میں بولی۔

شمیم! بولتے کیوں نہیں۔ رک کیوں گئے صاف کہہ دو نا میں شمیم ہوں۔

خورشید پریشان ہو کر بولی۔

سمیرا کہاں ہیں شمیم بھائی یہ تو ڈاکٹر اشرف ہیں۔

نہیں خورشید یہ شمیم ہیں۔ انہوں نے اپنا نام غلط بتا کر ہمیں دھوکے میں رکھا

ہے مجھ پر اعتبار نہ ہو تو پوچھ لو ان سے۔

خورشید دم بخود رہ گئی۔

کیوں ڈاکٹر! سمیرا ٹھیک کہہ رہی ہے۔

شمیم مجبوراً اپنے اصلی رنگ میں آ گیا۔ اور خورشید کی بات کا جواب دینے کے بجائے سمیرا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا سمیرا خدا کے لئے چپ رہو۔ زیادہ باتیں تمہارے لئے نقصان دہ ہیں میں نے کسی وجہ سے اپنے آپ کو عیاں نہیں کیا۔

خورشید غصے سے تلخ ہو کر بولی۔

بھائی جان! بہت خطرناک ڈرامہ کھیلا ہے آپ نے جیتے میں نہیں آپ سے بولوں گی۔

لیکن پروین فوراً آگے بڑھی اور شمیم کا شانہ پکڑ کر جھولتے ہوئے کہا۔

خورشید تم تو بیوقوف ہو اتنے عرصے کے بعد تو بھائی جان ملے ہیں اور تم ان سے تلخ کلامی کر رہی ہو خورشید کا بھی دل بھر آیا اور اٹھ کر شمیم کے ہاتھ تھام لئے۔

سمیرا پھر بولی۔

شمیم کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ میں کچھ نہیں کہوں گی۔

شمیم چپ چاپ بیٹھ گیا۔ خورشید اور پروین بھی اُس کے قریب بیٹھ گئیں۔

سمیرا نے بلا جھجک ان دونوں واقعوں کی تفصیل بتانا شروع کر دی۔ جن کی وجہ سے وہ بدظن ہو کر گھر سے بھاگ نکلا تھا۔

شمیم خاموشی سے بیٹھ کر سب کچھ سنتا رہا۔

سمیرا جب اپنی بات ختم کر چکی تو آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

کیا اب بھی آپ مجھ سے بدظن ہیں۔

شمیم نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

نہیں سمیرا! تم معصوم اور بے گناہ ہو میں باتوں ہی باتوں میں مجاہد سے سب کچھ دریافت کر چکا ہوں۔

آپ نے گھر چھوڑنے سے قبل مجھ سے تفصیل کیوں نہ چاہی۔

بس بھائی جان نے مجھے تم سے زیادہ بدظن کر دیا تھا۔

سمیرا نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

ان کے کہنے کی کیا بات تھی آپ نے مجھ سے گفتگو کی ہوتی گھر سے اس طرح بھاگنے سے پہلے میرے سینے میں خنجر گھونپ جاتے تاکہ میں آپ کے بعد دنیاوی غموں سے تو چھٹکارا پا جاتی۔

شمیم نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

سمیرا خدا کے لئے چپ رہو۔ مجھے اپنے مجرم ہونے کا زیادہ احساس نہ دلاؤ۔

سمیرا خاموش ہو گئی پردین فوراً اٹھی اور مجاہد کو شانے سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

بھائی جان دیکھئے کون آیا ہے۔

مجاہد نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

کون ہے۔

وہ دیکھئے سامنے۔ پردین نے شمیم کی طرف اشارہ کیا۔

کوئی بھی نہیں وہ تو ڈاکٹر اشرف ہیں۔ پاگل ہو گئی ہو کیا۔

نہیں بھائی جان وہ ڈاکٹر اشرف نہیں شمیم بھائی ہیں۔

مجاہد نے سمیرا سے پوچھا۔

کیوں سمیرا ٹھیک ہے یہ

سمیرا مسکرا پڑی۔

ہاں بھائی جان یہ اپنا نام غلط بتاتے ہیں۔

مجاہد پھلانگ لگا کر اٹھا اور شمیم سے لپٹ گیا۔

تھوڑی دیر تک سب خوش گپیاں لگاتے رہے پھر شمیم سمیرا کو مخاطب کرتے کرتے ہوئے بولا۔

سمیرا میں دو تین مریضوں کو دیکھ آؤں۔ ایک گھنٹہ تک آ کر تمہاری پٹی کھولتا ہوں۔

سمیرا نے بے قراری سے کہا۔

جلدی لوٹئے گا۔

میں ابھی آیا۔

شمیم باہر نکل گیا مجاہد، خورشید اور پردین ادھر ادھر کی باتوں سے سمیرا کا دل بہلانے لگے۔

مریضوں کو دیکھنے کا محض ایک بہانہ تھا۔ وہ سیدھا وارڈ کے آفس میں گیا۔ پیڈ سے

کاغذ پھاڑ کر تھوڑی دیر کچھ لکھتا رہا پھر میز پر سر ٹکاتے ہوئے خیالات کے تانے بانے بننے لگا۔ عین اس لمحہ ثریا اندر داخل ہوئی۔ شمیم کو اس حالت میں دیکھ کر ہمدردی سے بولی

ڈاکٹر! کیا بات ہے۔ تھک گئے کیا۔

شمیم نے سر اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

ڈاکٹر! ثریا پریشان ہو کر بولی تم رو رہے ہو۔ مجھے تمہاری پریشانیوں کا احساس ہے۔ سمیرا مجھے سب کچھ بتا چکی ہے وہ بلا رہی ہے تمہیں۔ اس کی پٹی کھولنے کا وقت بھی ہو چکا ہے۔

شمیم نے کچھ سوچا پھر میز پر پڑا ہوا کاغذ تہ کرنے کے بعد ثریا کی طرف بڑھا کر کہا۔

ثریا میں اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ اس کی آنکھیں ٹھیک ہو چکی ہیں۔ تم خود پٹی کھول دینا میں جا رہا ہوں۔ میری طرف سے اسے یہ خط دے دینا۔

ثریا نے کچھ اضطراب سے خط لیتے ہوئے پوچھا۔

کہاں جا رہے ہو ڈاکٹر؟

شمیم کی آواز میں ایک خلش سی تھی۔

اس کی نگاہوں سے دور جہاں میں اپنے آپ کو مجرم تصور نہ کر سکوں۔

نہیں ڈاکٹر! تمہیں اس کے پاس موجود رہنا چاہیئے آنکھیں کھلنے کے بعد تمہیں نہ پا کر اس کے دل پر کیا گزرے گی۔

شمیم اٹھ کر باہر برآمدے میں آ گیا۔ ثریا بھی اُس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ بیر اصغر عین سر پر چمک رہا تھا۔ صبح روشنی ہر چیز کے لبوں پر رقص کناں تھی۔ رات

آہستہ آہستہ بھیگتی جا رہی تھی منہ بند کلیاں شبنمی قطروں سے غسل کرنے لگیں دل کے ہاتھوں مجبور پھول جب چھپ چھپ کر ان کا خوبصورت سڈول اور برہنہ جسم دیکھنے کی کوشش کرتے تو کلیاں لجاتی ہوئی پودوں کے پتوں کی اوٹ میں ہو کر گھبراہٹ اور پریشانی سے لمبے لمبے سانس لینے لگتیں مرغ چمن نیند سے کوسوں دور پھول اور کلیوں کی یہ آنکھ مچولی آنکھوں میں جذبات کے گہرے سائے لئے مسکرا مسکرا دیکھ رہے تھے۔

شمیم برآمدے میں کھڑا جانے کیا سوچتا رہا تھا پھر سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا اور باغیچے میں سے ہوتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ ثریا گم سم کھڑی تھی۔ اچانک وہ پرسوز آواز سے بولی۔

رک جاؤ ڈاکٹر! لوٹ آؤ۔

شمیم سر جھکائے آگے ہی بڑھتا رہا۔

ثریا پھر چلائی۔

لوٹ آؤ ڈاکٹر! تمہارا اس کے پاس موجود ہونا بے حد ضروری ہے۔ وہ یہ منظر برداشت نہ کر سکے گی۔ ڈاکٹر! رک جاؤ۔ شمیم کے قدم آگے بڑھتے رہے۔ اور وہ بہت جلد پودوں کے جھنڈ میں روپوش ہو گیا۔ ثریا نے غم سے نڈھال ہو کر ستون کا سہارا لے لیا۔

تھوڑی دیر بعد ثریا نے جب خود سمیرا کی آنکھیں کھول لیں تو چند لمحے وہ بڑے دلچسپ انداز میں آنکھیں جھپکتی رہی۔ پھر مجاہد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بھائی جان میری آنکھیں ٹھیک ہو گئی ہیں میں اب دیکھ سکتی ہوں۔

مجاہد، خورشید اور پروین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

سمیرا ادھر اُدھر دیکھتے ہوتے پریشان ہو کر بولی۔

شمیم کہاں ہے۔

سب سوالیہ نگاہوں سے ثریا کی جانب دیکھنے لگے جواب میں اس نے ایک مجرم کی طرح آنکھیں جھکا لیں۔

سمیرا نے اسے جھنجھوڑ کر کہا۔

ثریا کہاں ہے شمیم۔

ثریا نے خاموشی سے سر جھکائے رکھا۔

سمیرا اس خاموشی سے جھلا گئی۔

چپ کیوں ہو جواب تو دو۔ کہاں ہیں وہ۔

ثریا نے سر آہستہ آہستہ اوپر اٹھاتے ہوتے دھیمی سی آواز میں کہا۔

وہ چلے گئے۔

کہاں؟ سمیرا زور سے چلائی۔

مجھے بتا کر نہیں گئے۔ ہاں آپ کے نام ایک خط چھوڑ گئے ہیں۔

سمیرا نے پریشان ہو کر کہا۔

کہاں ہے۔

ثریا نے خط اسے تھما دیا۔

سمیرا پڑھنے لگی۔

سمیرا! میں ایک بار پھر تم سے دور بھاگ رہا ہوں میں مجبور ہوں۔ سمیرا بہت تھا

مجبور ناسازگاری حالات کے لئے بے رحم تھپیڑوں نے مجھے ایک ایسے ساحل پر لا کھڑا کیا ہے۔ جہاں میں کھڑے ہو کر تمہیں پکار تو سکتا ہوں۔ لیکن پا نہیں سکتا بس یوں سمجھو میں اور تم ایک ہی ساگر کے دو کنارے ہیں۔ جو ایک ہی سمت میں اپنے اپنے راستے پر سفر تو کر سکتے ہیں لیکن آپس میں مل نہیں سکتے۔

مجھے معاف کر دینا سمیرا میں نے تمہیں بہت دکھ دیئے ہیں میں بہت ہی بدبخت ہوں جو اپنی محبت اس قدر قریب ہونے کے باوجود اسے گلے نہ لگا سکا۔ سمیرا میری ایک خواہش ہے۔ پوری کرو گی نا کسی اچھی جگہ شادی کر لو۔ یہ نہ خیال کرنا مجھے تم سے محبت نہیں مجھے تم سے محبت نہیں تھی۔ ہے اور مرتے دم تک رہے گی۔ لیکن حالات کی تلخیوں نے تم سے دور بھاگنے پر مجبور کر دیا ہے۔

بدبخت شمیم

خط ختم کر کے سمیرا دھڑ سے بستر پر گرنے ہی والی تھی کہ ثریا نے اسے سنبھال لیا۔ ناہید، خورشید اور پروین بھی سب کچھ سمجھ چکے تھے۔ ان کے چہروں پر مردنی چھا گئی اور تینوں سمیرا کو سہارا دیتے ہوتے ہسپتال سے باہر لے گئے۔

اف کتنا جانکاہ منظر تھا وہ۔

۲۱

رات بھیگ چلی تھی۔ شبنم کی دھند لاہٹ پھولوں کی پتیوں پر جمع ہو ہو کر قطرہ کی شکل اختیار کرتے ہوئے ان کے نازک لبوں کے طویل بوسے لینے لگی۔ لیکن پھول اس لگاتار بوس کنار سے تنگ آ جاتے تو بڑی رنگین اور دل آویز ادا سے اپنی کمر ایسا جھکا کر شبنم کے شفاف قطروں کو زمین پر پھینک دیتے۔ اور یوں یہ نازک اور رنگین اپنے مرمریں جسم سے جنس مخالف کا بوجھ ہلکا کرنے میں کامیاب ہو جاتیں۔

رات اپنا آنچل دراز کرتی رہی۔ چاند اسی طرح مسکراتا ہوا ضیا پاشی میں مصروف رہا۔ خنک اور مہک بار ہوائیں چاندنی کے راہوار پر سوار آوارہ مزاجی کا لطف اٹھاتی ہوئی اور مہ و انجم کا قافلہ محبت کے شوخ اور بھڑکیلے نغمے الاپتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور

جب چاندنی کا عریاں جسم رقص کرنے لگا تو گل و بلبل کے جذبات میں آگ سی لگ گئی۔
ایک ساتھ شب باشی کی تیاری کرنے لگے۔
شمیم ہسپتال سے سیدھا گھر آیا کار پورچ میں کھڑی کر کے ابھی وہ چند قدم اپنے
ے کی طرف بڑھا ویا کہ عالیہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔
شمیم بھائی! عصمت باجی کہاں ہیں۔
شمیم جو پتہ نہیں کن خیالات میں ڈوبا چلا جا رہا تھا فوراً متوجہ ہوا۔
اپنے کمرے میں ہوگی اور کہاں جائے گی۔
نہیں بھائی جان! وہ صبح سے گئی ابھی تک نہیں لوٹیں۔ میں شام تک ان کا انتظار
ہی کہ شاید گھر چلی گئی ہوں لیکن ابھی ابھی جب میں نے یہاں امی سے آکر پتہ کیا
ں نے بتایا ہے کہ عصمت آج گھر آئی ہی نہیں۔ میں نے پھر دل کو تسلی دی کہ شاید
کے پاس ہوسٹل چلی گئی ہوں۔ لیکن آپ کہہ رہے ہیں مجھے پتہ ہی نہیں۔
شمیم فکر مند ہو گیا۔
وہ صبح گئی کہاں تھی۔
بھائی جان! ایک دن صبح ہی صبح تین مرد اور ایک عورت میرے ساتھ کلینک
ہم باتیں کر رہے تھے نا۔ وہی جو آپ کو دیکھتے ہی آگے بڑھ گئے تھے اور
نے جب انہیں واپس بلانے کے لئے پوچھا تو آپ نے منع کر دیا تھا۔
شمیم نے کرب انگیز لہجے میں کہا۔
ہاں ہاں جلدی سے کہو آگے کیا ہوا۔

ان میں سے ایک موٹا اور لمبی مونچھوں والا آدمی پھر آج صبح آیا تھا اور عصمت باجی کو یہ کہہ کر ساتھ لے گیا۔ کہ ایک عورت سخت بیمار ہے۔ اب اس وقت سے وہ واپس نہیں لوٹیں۔

شمیم کا لہجہ اندوہ گیں ہو گیا۔

ظلم ہو گیا عالیہ وہ اچھے آدمی نہیں ہیں۔ انہوں نے ایک دفعہ سمیرا کو بھی اغوا کر لیا تھا۔ ضرور وہ عصمت کو بھی اغوا کر کے لے گئے ہیں۔

عالیہ کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔

اب کیا ہو گا بھائی جان۔

شمیم کی رگ غیرت پھڑک اٹھی کچھ سوچ کر عالیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

عالیہ تم یہیں امی جان کے پاس ہی رہو میں عصمت کو تلاش کرنے جاتا ہوں۔ جلدی جائیے بھائی جان وہ بیچاری ضرور کسی آفت میں پھنس گئی ہوں گی۔

شمیم الٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہوا۔

عالیہ زور سے چلائی۔

بھائی جان کار تو لیتے جائیے۔

نہیں نہیں میں پیدل ہی جاؤں گا شمیم نے مڑ کر پیچھے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر دوبارہ بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔

عالیہ عصمت کی امی عطیہ کو تسلی دینے کے لئے اس کے کمرے کی طرف چلی گئی

تھوڑی دیر بعد شمیم سرکلر روڈ کی ایک گلی کے اسی کمرے کے سامنے کھڑا تھا

ں سے ایک دفعہ اس نے سمیرا کو ان درندہ صفت انسانوں سے بچایا تھا۔ دروازہ باہر مقفل تھا۔ شمیم پریشان ہو گیا۔ لیکن وہ کچھ سوچ کر ساتھ والے مکان کے بیرونی ازے پر دستک دینے لگا۔ چند لمحوں بعد ایک ادھیڑ عمر کے مرد نے دروازہ کھولا۔ یم نے بڑی شائستگی سے پوچھا۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں۔ یہ آپ کے ہمسائے کہاں ہیں۔

بوڑھے نے تھوڑی دیر معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ پھر سرگوشی کے انداز میں کہا۔

یہاں مستقل نہیں رہتے کرایے دار ہیں۔ ویسے بھی مجھے آوارہ مزاج دکھائی دیتے

کچھ آپ کو پتہ ہو ان کی مستقل رہائش کہاں ہے۔

یہ تو خبر نہیں۔ ہاں ویسے یہ لاہور اکثر جاتے آتے رہتے ہیں۔

ان کے نام بتا سکیں گے آپ۔

ال ہاں ضرور۔ وہ جو موٹا اور بڑی مونچھوں والا ہے نا اس کا نام جمال ہے۔ باقی دو سے جو ذرا چھریرے بدن کا ہے۔ اس نام عبدل اور جو ذرا اس سے موٹا ہے اور ہے۔ اس کا نام اجمل ہے۔

شمیم فوراً واپس مڑا اور اسی وقت بس سے لاہور روانہ ہو گیا۔

کئی روز تک اس نے ایک ہوٹل میں قیام کر کے بڑی تندہی سے عصمت کو ش کیا لیکن اس کا کہیں سراغ نہ ملا۔ آخر تنگ آ کر اس نے ڈاکٹری کا لبادہ اتار ا اور ایک دفعہ پھر سے آوارہ گرد اور قمار باز بن گیا۔ چند ہی ماہ بعد وہ اپنے آبی

مکے اور قمار بازی میں چابک دستی کی بنا پر شہر کے سارے غنڈوں پر حاوی ہو گیا۔ اور سب اس کی طاقت اور فوقیت کا لوہا ماننے لگے۔ ہوٹل کے بجائے اب اس کا قیام ایک نائٹ کلب کے کمرہ نمبر ۴ میں تھا۔ جہاں شہر کے گنے چنے جواری کافی رات گئے تک جوا کھیلتے رہتے۔ شمیم دن بھر عصمت کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔ رات اکثر کلب میں ہی گزار دیتا یا کبھی ادھر ادھر قمار بازوں کے دوسرے اڈوں پر گھومتا رہتا۔

قمار بازی میں سیک دست ہونے کی وجہ سے۔ اس کے پاس ہزاروں روپیہ رہتا جو چند گھڑے دوستوں کی محفل میں ادھر اُدھر اڑا جاتا اسی دوران ریاض نامی قمار باز سے بے حد گھڑے مراسم ہو گئے۔ جو شکل و صورت کا تو کچھ یوں ہی تھا۔ لیکن وفاداری میں نایاب اور ہر معاملہ میں شمیم کی تائید کرنا وہ جیسے اپنا فرض سمجھتا تھا۔

نائٹ کلب میں ایک روز معمول سے کہیں زیادہ چہل پہل تھی کلب مختلف انواع اور مختلف طبع کے آدمیوں سے کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ باہر پورچ کے ساتھ ساتھ اس قدر ان گنت کاریں اکٹھی ہو گئی تھیں کہ یوں محسوس ہونے لگا جیسے پورا شہر سمٹ کر کلب میں ہی آگیا ہو۔ آج ایک مشہور مصری رقاصہ کا رقص تھا جو نئی نئی پاکستان آئی تھی۔ اور کراچی میں اپنے ہوشربا رقص اور جنسی ترغیب سے بھرپور جسم کے بل بوتے پر پورے ملک میں قیامت کی شکل اختیار کر گئی تھی۔

کلب کی اوپر والی منزل کے کمرہ نمبر ۴ کا وہی عالم تھا۔ چار آدمی بیٹھے جوا کھیل رہے تھے۔ جس میں شمیم بھی تھا۔ اس کے بالکل پیچھے ریاض کھڑا تھا۔ اس کے علاوہ کمرے میں چھ سات آدمی اور بھی تھے۔ جو ایک میز کے گرد بیٹھے مے نوشی میں مصروف تھے۔ شمیم

کے بائیں طرف ایک یورپین لڑکی بھی کھڑی تھی۔ جو سیاہ رنگ کی تنگ پتلون اور سفید بوشرٹ پہنے ہوئے تھی۔ وہ بار بار جذبات سے مغلوب ہو کر اپنا ہاتھ شمیم کے کندھے پر رکھ دیتی۔ لیکن وہ ہر بار بے رخی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیتا۔ شمیم کے سامنے ایک لمبا سا خنجر میز میں پیوست کھڑا تھا۔ جس کا چمکتا ہوا چوڑا پھل کمرے کے ماحول کو اور زیادہ وحشت ناک بناتے ہوئے تھا۔

شمیم اب تک پانچ ہزار روپیہ جیت چکا تھا۔ آرکسٹرا مدھم سروں میں بجنے لگا۔

ریاض نے بے چین ہو کر شمیم کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

بس کرو شمیم! اب تو نیچے رقص بھی شروع ہونے والا ہے۔

شمیم اپنے پتے درست کرتے ہوئے بولا۔

ہم رقص یہیں گیلری میں ہی بیٹھ کر ہی دیکھیں گے ویسے بھی اب یہ آخری ہاتھ ہے

شمیم نے جب آخری پتہ پھینکا تو اس سامنے بیٹھا ہوا آدمی جو آج بری طرح ہارا تھا۔ میز پر بکھرے سارے نوٹوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے زور سے چلایا دھوکا فریب۔

شمیم کی آنکھیں سرخ ہو گئیں غصے سے بریں تن گئیں ایک جھٹکے کے ساتھ خنجر میز سے نکال لیا اور اس کا گریبان پکڑ کر ڈرانے کے انداز میں گرجا۔

بے ایمان فریبی کس نے کہا ہے دھوکہ میں ساری رقم جیت چکا ہوں۔

شمیم کو ایک ہاتھ سے اپنا گریبان اور دوسرے سے ہوا میں وزنی خنجر لہراتے دیکھ کر وہ کانپنے لگا۔ اور ہاتھ جوڑ کر رحم طلب نگاہوں سے شمیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

معاف کر دو استاد غلطی ہو گئی۔

شمیم نے کچھ سوچتے ہوئے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ اور اپنا خنجر بند کر کے پتلون کی جیب میں ڈالنے کے بعد اس نے میز پر بکھرے ہوئے سارے نوٹ سمیٹ کر اپنے کوٹ کی جیب میں ٹھونس لئے۔

کمرے میں بیٹھے ہوئے۔ سارے قمار باز اپنی اپنی کرسی اٹھا کر گیلری میں آ بیٹھے۔ آرکسٹرا کی آواز اب تیز اور اونچی ہونے لگی تھی یکایک بریلٹ۔ اور طاؤس زور سے بج اٹھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بے حد حسین۔ مصری لڑکی سٹیج پر نمودار ہوئی۔ چند لمحے تک تماشائیوں کی طرف دیکھا پھر اپنی کمر کو قیامت خیز بل دے کر اس نے عرب کی صحرائی اور خانہ بدوش لڑکیوں کا مخصوص ڈانس شروع کر دیا وہ صرف انگیا اور باریک سفید جالی کا لہنگا پہنے ہوئے تھی اور اس کے کولہوں کے سامنے ایک ریشمی پٹی برائے نام پردے کا کام دے رہی تھی۔ اور اس کا جسم صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی انگیا چھاتیوں کے ابھار کو پوری طرح ڈھانپنے سے قاصر تھی۔ اور ان کا بالائی حصہ صاف نظر آ رہا تھا۔ لہنگا اس نے کچھ اس قدر نیچے پہن رکھا تھا کہ اس کے بھرے بھرے اور چکنے کولہے بالکل برہنہ ہو کر رہ گئے تھے۔

بریلٹ اور طاؤس کی آواز کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ اس کے جسم کا رواں رواں محو رقص تھا۔ اس کی آنکھیں دل کو جلانے والے شعلے برسا رہی تھیں اور پھر جسم ہلکا ہلکا پسینہ آنا شروع ہوا۔ اس کا جھیگا جھیگا خوبصورت اور عریاں جسم تماشائیوں کے دلوں میں اٹھتی ہوئی جنسی بھوک کو اور تیز کرنے لگا۔

جلد ہی اس نے اپنا قاتل ادا کے ساتھ اپنا رخ تماشائیوں کی مخالف سمت

کر لیا۔ اب تماشائیوں کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔ اور اس کے کولہے کچھ اس طرح تھرتھرا رہے تھے۔ جیسے ان میں بجلی کی لہر دوڑ رہی ہو کچھ دیر ایسا ہی سماں رہا۔ آخر اس نے اپنا رخ پھر تماشائیوں کی طرف کیا۔ اب اس کا پورا جسم ساکن تھا۔ لیکن کولہے اور چھاتیوں کے دونوں ابھار کچھ اس قدر تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ کہ تماشائی دم بخود رہ گئے اور یوں محسوس کرنے لگا جیسے اس کے ابھار انگیا کے نازک بند کو توڑ کر بالکل باہر نکل آئیں گے اور لہنگا جو پہلے ہی کافی ڈھلکا ہوا تھا۔ لیکن ایسا نہ ہوا وہ اپنا رقص ختم کر کے واپس چلی گئی تماشائی ہونٹوں پر زبان پھیرتے رہ گئے۔

اوپر بیٹھے ہوئے سارے قمار باز ابھی تک خاموشی سے بیٹھے تھے۔ ریاض کی نگاہیں اب سٹیج پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ شمیم نے اس کا شانہ جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

اے ہوش میں آؤ۔ کہاں پہنچ گئے ہو۔

ریاض نے ایک ٹھنڈا نالہ سرد کیا۔

اف! قتل کر گئی ظالم۔

اچھا اب چھوڑو اس پاگل پن کو۔ چلو کھانا کھانے چلیں۔

چلو چلو! رقص اٹھ کھڑا ہوا اور وہاں آج ایک اور پروگرام بھی ہے۔

شمیم گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

کیا؟

آج ... آج۔

کیا آج آج۔ کچھ بھولو تو۔

شاہی بازار میں ایک بے حد حسین اور قاتل اداؤں والی رقاصہ آئی ہے۔ لوگ ٹرین یا سینما کی سیٹیں بک کراتے ہیں۔ لیکن اس کی راتیں بک ہوتی ہیں۔ یس جس کے دام بھاری پوری رات اسی کی۔

کیا ہے اس کا۔

نرگس۔

تم ہو آنا۔ میں تو کھانا کھا سو جاؤں گا۔

میں تو پہلے بھی کئی بار ہو آیا ہوں آج تمہیں بھی ساتھ جانا ہوگا۔

کوئی ضروری ہے کیا۔

ہاں۔

کیوں؟

اس نے مجھے ایک بار طعنہ دیا تھا۔

کیا؟

میں نے ایک بار اسے ایک رات کے لئے ایک ہزار روپیہ پیش کیا۔ میری رقم سب سے زیادہ بھی تھی لیکن۔۔۔

شمیم نے اس کی بات کاٹ دی۔

پھر کیا کہا اس نے۔

کہنے لگی پہلے کسی سنگ تراش سے اپنا چہرہ درست کرا کر آؤ۔ پھر ایسی فرمائش کرنا وہ پیسے کی نسبت خوبصورتی کو زیادہ ترجیح دیتی ہے۔ سسری کچھ حسن پرست ہے

مائد۔

تو اب میرے جانے سے کیا فائدہ۔

میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ میرے خوبصورتی میں اسے بھی مات کئے ہوئے ہیں۔

تو کیا تم مجھے خوبصورت سمجھتے ہو۔

بالکل قسمیہ کہتا ہوں میں نے آج تک تم جیسا خوبصورت اور اعلیٰ شخصیت جوان کبھی نہیں دیکھا۔

شمیم مسکرانے لگا۔

چلو گے نا۔

بھئی تم مجبور کر رہے ہو تو جانا ہی پڑے گا۔

ریاض اس سے لپٹ گیا۔

او۔ بہت اچھے شمیم بہت اچھے۔

لیکن کھانے کے بعد۔

ہاں ہاں ضرور۔

دونوں اٹھ کر نیچے آئے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کلب سے باہر نکل گئے۔

کھانے کے بعد دونوں شاہی بازار کی ایک عمارت کی دوسری منزل میں ایک حسین اور نوخیز رقاصہ نرگس کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ گھنگروؤں کی جھنکار اور طبلہ کی تھاپ نے ایک عجیب سا سماں پیدا کر رکھا تھا۔ نرگس رقص کی طرف کم راغب اور شمیم کی طرف زیادہ۔ دیکھ رہی تھی۔ جیسے وہ اس کی موٹی موٹی سیاہ آنکھوں

میں کھو جانا چاہتی ہو۔ لیکن وہ نہ جانے کیوں چہرہ جھکائے اداس بیٹھا تھا۔

کمرے میں تین آدمی اور بھی بیٹھے نرگس پر نوٹوں کی بارش کر رہے تھے۔ لیکن اسے شمیم کی طرف راغب دیکھ کر وہ اپنی جگہوں سے اٹھ کر منہ بسورتے ہوئے باہر نکل گئے نرگس اپنا رقص ختم کر چکی۔ شمیم اسی طرح خیالات میں گم بیٹھا تھا۔ ہال ریاض پورا طرح ماحول سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ نرگس آہستگی سے اس کی طرف بڑھی اور مترنم آواز سے پوچھا۔

یہ کون ہے؟ اس نے شمیم کی طرف اشارہ کیا۔

ریاض مسکرانے لگا۔

میرا دوست ہے۔

کیا نام ہے۔

شمیم۔

پہلے کبھی نہیں تمہارے ساتھ دیکھا۔

وہ ایسی جگہوں میں نہیں آتا۔ آج میرے مجبور کرنے پر آگیا ہے۔

اداس اداس کیوں بیٹھا ہے۔

بس تلخ حالات نے ایسا بنا دیا ہے۔

کچھ مجھے بھی بتاؤ اس کے متعلق۔

سب کچھ بتا دوں گا۔ پہلے یہ بولو کتنا مال لوگی آج کی رات کا آج میرے دوست کے پاس ان گنت نوٹ ہیں جتنے مانگو گی۔ مل جائیں گے۔

تو کیا اس سے لے کر دو گے۔

ہاں۔

کیوں؟

میرا اس کا حساب اکٹھا ہی رہتا ہے۔

نرگس نے کچھ اور کہنا چاہا ہی تھا کہ شمیم کھڑا ہو گیا۔ نرگس نے فوراً آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

بیٹھ جائیے اٹھ کیوں گئے۔

شمیم کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ پھر وہ ریاض کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

کچھ مال چاہیئے۔

ریاض ایک دم بولا۔

ہاں ہاں ضرور۔

لیکن نرگس نے دخل اندازی کی۔

نہیں کچھ نہیں چاہیئے اسے۔ آج اسے ایک پیسہ نہ دیجئے بس آپ بیٹھ جایئے نا۔

شمیم نے دونوں کی طرف جستجو کی نگاہ سے دیکھا پھر اپنے ہاتھ چھڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔

ریاض نے شکایتاً کہا۔

نرگس! تم نے اس سے پیسے کیوں نہیں لینے دیئے۔

نرگس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

ایسے آدمی سے پیسے لئے نہیں، دیئے جاتے ہیں۔

ہوں، تو دکھائی دیتا ہے دل دے بیٹھی ہو۔

وہ ہے ہی اس قابل۔

تو پھر میری آج کی رات کا کیا ہوگا۔

تم آج رات میرے پاس ہی رہو گے۔ لیکن ایک شرط پر۔

ریاض کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔

کیا۔؟

تم اسے اپنے ساتھ لاتے رہا کرو گے۔

شمیم کو۔

ہاں۔

یہ تو کوئی مشکل کام نہیں میں روزانہ لے آیا کروں گا۔

پکا وعدہ ہوا نا پھر۔

بالکل پکا۔

نرگس مسکرا دی۔ پھر ریاض کا ہاتھ پکڑ کر اپنی خواب گاہ میں لے گئی۔

۲۲

نرگس کے کمرے سے شمیم نکل کر شمیم مختلف رقاصاؤں کے کمروں کے سامنے رتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک کمرے کے سامنے اس کے قدم جم کر رہ گئے اندر نیم دائرے نکل میں بیٹھے ہوئے کچھ لوگوں کے درمیان عصمت محوِ رقص تھی۔ شمیم کی آنکھوں میں غضب کی بجلیاں کوند گئیں۔ بغیر کسی توقف کے وہ اندر داخل ہو گیا۔ عصمت اسے ہی رقص چھوڑ کر شمیم، شمیم، پکارتی ہوئی بھاگ کر اس سے لپٹ گئی

تماشائی دم بخود رہ گئے۔ دونوں میاں بیوی ابھی تک ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے ایک کمرے سے جمال غصے میں بل کھاتا ہوا نمودار ہوا اس کے پیچھے پیچھے عبدل اور لی تھے۔ جمال نے فوراً آگے بڑھ کر عصمت کو علیحدہ کر دیا اور شمیم کی طرف کھانے والی ل سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

کون ہو تم۔

شمیم نے سنسناتا ہوا ایک فولادی گھونسہ اس کے جبڑے پر دے مارا۔

ذلیل کتے۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی پوچھتے ہو۔ میں کون ہوں؟

جمال دھڑسے فرش پر گیا۔

عبدل اور اجمل فوراً شمیم پر ٹوٹ پڑے۔

کمرہ لگاتار مکوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ سارے تماشائی گھبراہٹ میں اٹھ کھڑے ہوئے عصمت پریشان اور گھبرائی ہوئی ایک طرف کھڑی ہوگئی شمیم نے دائیں بائیں کے مکوں پاؤں کی ٹھوکروں اور لاتوں سے کام لیتے ہوئے عبدل اور اجمل کو مار مار کر بدحال کر دیا۔ شمیم کو تینوں کی پٹائی کرتے دیکھ کر تماشائی اس کی پھرتی، جرأت اور ہمت پر حیران رہ گئے۔ عصمت کے ہونٹوں پر اب مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

ناگاہ کمرے کے بیرونی دروازے سے دوسری رقاصاؤں کے چھوٹے کٹے ٹھیکیدار اندر داخل ہوئے اور انہوں نے آتے ہی شمیم پر گھونسوں کی بوچھاڑ کر دی۔ عصمت کی حالت اب قابل دید تھی۔ اس پر غشی کی حالت طاری ہو رہی تھی آنکھوں سے آنسوؤں کے فوارے چھوٹ نکلے ٹانگیں خوف سے لرزنے لگیں خوف سے لرزنے لگیں اور دیوار کا سہارا لیتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر لیں تماشائیوں میں سے کسی نے بھی آگے بڑھ کر شمیم کی مدد کر کے معاشرے کی لٹ سلجھانے کی کوشش نہ کی اور سارے غنڈوں نے شمیم کو مار مار کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ عصمت کا دل دہل گیا اور وہ نڈھال کر فرش پر گر گئی۔

شمیم بڑی بے بسی سے گلی کے پکے فرش پر گرا کافی دیر وہ وہیں پڑا اپنی چوٹیں سہلاتا رہا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے فوراً اس طرح اٹھ کھڑا ہوا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہیں کھڑے کھڑے ابھی وہ اپنے کپڑے ہی جھاڑ رہا تھا کہ اس کی نگاہیں۔ عمارت کے اوپر سے اترتی ہوئی سیڑھیوں کے دروازے پر جم کر رہ گئیں۔ جمال عصمت کو لئے دروازے سے باہر آ رہا تھا ان دونوں کے پیچھے عبدل اور اجمل بھی تھے۔ شمیم بڑی رازداری سے ان کا تعاقب کرنے لگا۔ وہ عصمت کو لئے سڑک پر آئے اور ایک ٹیکسی سٹینڈ پر آ کھڑے ہوئے۔ شمیم بھی ان سے دور ایک دیوار کے سائے میں کھڑا ہو گیا۔ جمال جو عصمت کا بازو پکڑے ہوئے تھا۔ اجمل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اجمل ہم کچھ دن روپوش رہیں گے۔ ہو سکتا ہے وہ پولیس کو اطلاع کر دے عبدل بھی میرے ساتھ رہے گا۔ تم پیچھے دوسری لڑکیوں کا خیال رکھنا۔ اور ہاں اگر وہ پھر ادھر کا چکر لگائے۔ تو اس کی طرح پٹائی کرا دینا۔ ویسے آج کی مار کے بعد آئندہ اسے ادھر کا رخ تو نہیں کرنا چاہیے۔

اتنا کہنے کے بعد جمال، عصمت اور عبدل کے ساتھ ایک ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ اجمل وہیں کھڑا رہا۔ شمیم بھی فوراً سائے سے باہر آیا۔ روشنی میں چند ہی قدم وہ آگے بڑھا تھا کہ اجمل نے اسے دیکھ لیا وہ شمیم کو وہاں دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ لیکن شمیم اس کی طرف دھیان دیئے بغیر ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر جمال کا تعاقب کرنے لگا۔ اجمل نے کچھ دیر وہاں کھڑے ہو کر سوچا پھر وہ بھی ایک ٹیکسی میں ہم کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا تینوں ٹیکسیاں آگے پیچھے کچھ دیر تک تارکول کی مختلف سڑکوں پر بھاگتی رہیں۔

آخر شاہدرہ اسٹیشن کے قریب۔ جمال کی ٹیکسی رکی اور وہ عصمت کا بازو پکڑے

جال کی طرح پھیلی ہوئی ریلوے لائنز کی طرف بڑھنے لگا عبدل ان دونوں کے پیچھے پیچھے تھا۔ تھوڑی دیر بعد شمیم بھی وہیں اترا اور ان کے پیچھے بھاگنے لگا۔ ریلوے لائنز کے عین درمیان میں اس نے جمال اور عبدل کو جالیا اجمل تھوڑا پیچھے رہ گیا تھا۔

عصمت کو چھوڑ کر جمال اور عبدل شمیم سے گتھم گتھا ہو گئے عصمت لائنوں میں ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی شمیم نے ایک پُرزور گھونسہ عبدل کے منہ پر مارا وہ اپنا چہرہ سہلاتا ہوا پیچھے ہٹا۔ اور عصمت کا بازو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اب شمیم اور جمال گتھم گتھا ہو گئے۔ جلد ہی شمیم نے مکوں کی ناقابل برداشت بوچھاڑ سے جمال کو چکرا کر رکھ دیا۔ جمال لڑکھڑانے لگا۔ اور بڑی بے چارگی سے ریلوے لائن پر گر گیا۔ شمیم اس کے اوپر لیٹ کر اس کے چہرے پر اپنے مکوں سے نشان لگانے لگا۔

جلد ہی ایک طرف سے ٹرین آتی ہوئی دکھائی دی۔ عبدل عصمت کو کھینچتا ہوا لائنوں سے باہر نکل گیا ٹرین بالکل قریب پہنچ گئی تھی۔ جمال گھبرا گیا اپنی دونوں ٹانگیں شمیم کے پیٹ میں جماتے ہوئے اُسے وہاں پھینک دیا اور پھر بڑی تیزی سے عبدل اور عصمت کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

شمیم سنگلاخ پتھروں پر گرنے کے بعد فوراً اٹھا۔ ٹرین اب بالکل نزدیک تھی۔ اس نے بھاگ کر لائن عبور کر کے جمال کی طرف جانا چاہا ہی تھا کہ پیچھے سے اجمل نے چاقو سے اس پر وار کر دیا شمیم نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے دونوں ہاتھوں پر اوپر اٹھایا۔ اور لائن پر پٹخ دیا وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ بدحواسی میں شمیم کی طرف آنے کی بجائے اس نے جو بھاگ کر دوسری جانب جانے کی کوشش کی تو ٹرین کا انجن بھک بھک کرتا ہوا اس کے اوپر سے گزر گیا۔ فضا میں ایک خوفناک چیخ بلند ہوئی اور اجمل کی لاش کے پرخچے اڑ گئے۔

جمال جسے اجمل کے آنے کی خبر نہ تھی عصمت کے پاس پہنچ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"سسرا! ہمیں ختم کرنے آیا تھا خود ٹرین کے نیچے آگیا" عصمت نے ایک بھیانک چیخ بلند کی اور بے ہوش ہو کر گر پڑی جمال اور عبدل اسے اٹھا کر رات کے اندھیرے میں ایک طرف بھاگنے لگا۔

شمیم بڑی بے چینی سے گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن ساٹھ ستر ڈبوں پر مشتمل مال گاڑی آہستہ آہستہ گزرتے ہوئے کافی دیر لگا رہی تھی۔ شمیم کا جی چاہا بھاگ کر گاڑی کے آگے سے گزر جائے۔ لیکن یہ تو نادانی پر مشتمل ایک خام خیالی تھا۔ اور اسی طرح انتظار ہی کرنا پڑا فرخدا خدا کر کے گاڑی گزر گئی۔ شمیم بھاگتا ہوا آگے بڑھا لیکن جمال اور عبدل عصمت کو لے کر جانے کہاں روپوش ہو چکے تھے۔ شمیم کئی گھنٹے لگاتار انہیں بڑھتی تگ و دو سے تلاش کرتا رہا آخر تھک ہار کر سیالکوٹ سے آنے والی پسنجر ٹرین سے لاہور چلا آیا۔ رات کا باقی ماندہ اس نے لاہور اسٹیشن کے مسافر خانہ میں لکڑی کے بنچ پر گزارا۔

صبح آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ سارا بدن تھکاوٹ سے ٹوٹ رہا تھا۔ پلیٹ فارم سے باہر آیا ہاتھ منہ دھونے کے بعد وہ ایک قریبی ہوٹل سے ناشتہ کر کے باہر نکلا ہی تھا کہ ایک کار والا ایک نوجوان سالہ لڑکے کو کھینچتا ہوا مسافر خانہ سے باہر آ رہا تھا بچے کے ہاتھ میں ٹین ٹافیوں سے بھرا ہوا پلاسٹک کا ایک چھوٹا سا تھیلا تھا اور وہ بڑی عاجزی سے کار والے کی منت کر رہا تھا۔

خدا کے لئے آج چھوڑ دو۔ پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کرونگا۔ وہ بُری طرح رو رہا تھا۔

پولیس کا سپاہی شمیم کو جاننے والا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے آگے بڑھا اور اسے مخاطب

کرتے ہوئے کہا۔

چھوڑ دو بچارے کو کیوں تنگ کرتے ہو۔

سپاہی بپھر گیا۔

ہم نہیں۔ بلکہ یہ تنگ کرتے ہیں۔ دیکھو تو نہ اجازت نامہ نہ کچھ اور ٹرین میں ٹافیاں بیچ رہا تھا۔

شمیم نے بڑی رحمدلی سے بچے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اچھا آج چھوڑ دو ایسے آئندہ ایسا نہیں کرے گا۔

سپاہی نے کچھ دیر احتجاج کی نگاہوں سے شمیم کی طرف دیکھا پھر بچے کے ایک زوردار تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔

دفع ہو جا یہاں سے۔ آج تو چھوڑ دیا ہے۔ آئندہ ایسی حرکت کی تو جیل کی ہوا کھانا پڑے گی۔

بچہ پیچھے ہٹ کر رونے لگا اور سپاہی قریبی ہوٹل میں داخل ہو گیا۔

شمیم کچھ دیر اسے پیار سے دیکھتا رہا۔ پھر آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر پچکارتے ہوئے پوچھا۔

تم یہ کام کیوں کرتے ہو۔

اس نے روتے ہوئے کہا۔

یہ کام نہ کروں۔ تو کھاؤں کہاں سے۔

شمیم نے پریشانی سے کہا۔

کیوں تمہارے ماں باپ کہاں ہیں۔

ماں مر گئی ہے۔

اور باپ

وہ ایک فیکٹری میں چپڑاسی تھے۔ لیکن اب ان کی آنکھیں خراب ہو گئی۔ میں اس کام پر نہیں جا سکے۔

تمہارا کوئی بڑا بھائی نہیں؟

نہیں صرف دو بہنیں ہیں۔

تم سے بڑی ہیں۔

ہاں۔

شمیم نے کچھ پھر اپنے کوٹ اور پتلون کی جیبوں میں ٹھونسے ہوئے پانچ ہزار کے نوٹ اس کے بوسیدہ اور پھٹے پرانے کوٹ کی جیبوں میں ڈالتے ہوئے کہا۔

یہ لو سارے نوٹ لے جاؤ اور آئندہ یہ کام نہ کرنا۔

وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔

نہیں میں نہیں لونگا۔ باجی ماریں گی۔

شمیم نے زبردستی سارے نوٹ اس کی جیبوں میں ڈال کر تسلی دیتے ہوئے کہا

نہیں ماریں گی۔ تم یہ سارا واقعہ جب انہیں صحیح صحیح کہہ دو گے تو وہ یقیناً تمہیں

حیرانگی سے دیکھنے لگا۔ شمیم نے پھر اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

تمہارا نام کیا ہے۔

شاہین اس نے بڑے مہذب لہجے میں جواب دیا۔

پڑھتے ہو کیا۔

پانچویں میں پڑھتا تھا۔ لیکن اب چھوڑ دیا ہے۔

اچھا اب تم جاؤ۔ روپے کہیں پھینکنا نہیں گھر جا کر دینا اور ہاں آئندہ یہ کام نہ کرنا

شاہین اسے بڑی نخوت سے دیکھتا آگے بڑھ گیا۔ شمیم اسے کھڑا دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا اس نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا لائٹر سے سگریٹ سلگایا اور ابھی ایک لمبا کش ہی لیا تھا کہ ایک ٹیکسی پاس سے گزری شمیم بازار کا انداز میں اُسے روکتے ہوئے بولا۔

اے ٹیکسی!

ٹیکسی رک گئی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر بیٹھا اور کلب روانہ ہو گیا۔

شمیم کلب پہنچا ریاض نہ تھا وہ بھی تھوڑی دیر وہاں رکا پھر باہر نکل گیا۔ سارا دن وہ عصمت کی تلاش میں سرگرداں رہا آخر شام ڈھلنے کے بعد کوئی فیصلہ کرتے ہوئے اس نے شاہی بازار کا رُخ کیا اور اسی عمارت کی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد نرگس کے کمرہ میں داخل ہوا۔

نرگس رقص کی تیاری کر رہی تھی۔ شمیم کو اپنے کمرے میں دیکھ کر وہ بڑبڑ پیشانی سے پیش آئی اور چہرے پر لبسوں خیز تبسم بکھیرتے ہوئے بولی۔

زہے نصیب جو آپ خود یہاں آنے لگے۔

شمیم نے کوئی جواب نہ دیا۔

نرگس آگے بڑھی اور شمیم کا ہاتھ پکڑ کر اپنی خواب گاہ میں لے گئی۔

دونوں ایک دوسرے کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہی آخر نرگس کی مترنم آواز گونجی۔

کہیے میں آپ کی کیا خدمت کروں

شمیم اس سوال پر بدحواس ہو گیا۔

دراصل میں۔۔۔ ایک۔

آپ رکنے کیوں لگے۔ آپ کی خاطر تو میں جان دینے کو تیار رہوں۔

شمیم نے کچھ تعجب سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

نرگس!

جی۔

ایک بات پوچھوں۔

ضرور پوچھیے۔

برا تو نہ مان جاؤ گی۔

ہرگز نہیں۔

تم یہ دھندا کیوں کرتی ہو۔

شمیم! معاشرے کا ہر فرد ہم سے یہی سوال کرتا ہے۔ کیا کبھی کسی نے ہم سے

یہاں آنے کی وجوہات پوچھ کر ان کا سدباب بھی کیا ہے لیکن تم چاہو تو یہاں سے چھٹکارا بھی پا سکتی ہو۔

بالکل ناممکن۔ ہم یہاں خوش ضرور دکھائی دیتی ہوں لیکن کوئی دل ٹٹول کر دیکھے تو پتہ چلے کہ ہماری حالت پنجرے میں بند پنچھی سے کسی طرح مختلف نہیں۔ اور اگر کسی طرح یہاں سے بچ نکلنے کا موقع مل بھی جائے تو ہم جائیں بھی کہاں۔ عصمت کا وہ نایاب موتی تو ہم سے چھن چکا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرہ ہمیں کہیں بھی برداشت نہیں کرتا۔

شمیم نے تھوڑی سی سوچ کے بعد کہا۔

لیکن معاشرہ بھی تو ایسا کرنے میں حق بجانب ہیں۔

نرگس اس بات پر بھڑک اٹھی۔

بالکل غلط۔ میں ماننے کے لئے تیار نہیں۔

وہ کیوں۔

معاشرہ ایسا کرنے میں کیسے حق بجانب ہے۔ آپ دیکھتے ہیں۔ ہمارے پاس بڑی بڑی توندوں والے سیٹھ روزانہ آکر صرف دولت کے بل بوتے پر ہمارے ساتھ شب باشی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ یہاں سے نکلنے کے بعد سوسائٹی میں ان کی وہی عزت اور قدر رہتی ہے جو یہاں آنے سے قبل ہوتی ہے۔ اور معاشرے میں وہ بڑے وقار سے گردن اٹھا کر چل سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں ایسا مقام حاصل نہیں ہمیں گھٹیا اور ذلیل سمجھا ہے۔ حالانکہ دونوں کا گناہ ایک جیسا ہی سنگین ہوتا ہے۔

پھر معاشرہ انہیں وہی وقعت کیوں دیتا ہے اور ہمارے نام پر تھوکتا کیوں ہے۔ آخر ایک ہی جرم کے دو مجرموں سے علیحدہ علیحدہ سلوک کیوں۔

اور پھر اسلام میں کیا آپ ایسی ناسمادات پسند کریں گے۔

جواب معقول تھا۔ شمیم گردن جھکا کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

نرگس نے ایک اور تیر چھوڑا۔

کیا مردوں پر ہٹ سے آپ برا مان گئے۔

شمیم نے چونک کر سر اٹھایا۔

نہیں ایسی بات نہیں۔

پھر آپ کی یہ حالت کیوں۔

تم نے جو کچھ کہا ہے بالکل ٹھیک ہے نرگس! میں تمہارے ان خیالات کی قدر کرتا ہوں

نرگس مسکرا دی۔

شکر ہے آپ نے تائید تو کی۔

شمیم نے اب موضوع بدلا۔

اچھا نرگس چھوڑو اس بحث کو۔ جس کے مقصد کے لئے میں آیا ہوں اس کے متعلق کچھ بتاؤ۔

پوچھئے جو پوچھنا ہے آپ نے۔

اسی عمارت میں ایک قاصرہ تھی نا عصمت۔

ہاں ہاں اسے تو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔

کیا تم بتا سکوں گی آج وہ کہاں ہے۔

نرگس کچھ رک کر بولی۔

سنا ہے کل اس کا کوئی چاہنے والا یہاں آگیا تھا۔ اس کے آدمیوں نے اسے مار مار کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور عصمت کو اسی وقت لے کر کہیں روپوش ہوگئے۔

اتنا تو میں بھی جانتا ہوں۔ تم صرف یہ بتاؤ وہ اس وقت ہوگی کہاں۔

نرگس مضطرب نظر آنے لگی۔

تو کیا آپ ہی لے گئے تھے۔ وہاں۔

ہاں؟

کیا آپ عصمت سے محبت کرتے ہیں۔

بالکل۔

کب سے جانتے ہیں اسے۔

وہ میری رشتہ دار ہے۔ یہ لوگ اسے اغوا کر کے لے آئے ہیں۔

نرگس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

کتنا بڑا ظلم ہے۔ ایک گھریلو لڑکی کو اٹھا کر اس بازار کی زینت بنا دیا۔

شمیم کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔ لیکن ضبط کرتے ہوئے پھر پوچھا۔

کیا تمہیں پتہ ہے وہ کہاں ہے آج۔

نرگس نے بڑی مایوسی سے کہا۔

شمیم! قسم کہتی ہوں مجھے کوئی علم نہیں۔ مجھے اگر تھوڑی بہت بھی خبر ہوتی تو ضرور تمہیں بتا دیتی۔

شمیم اٹھ کھڑا ہوا۔

اچھا نرگس میں چلتا ہوں۔ تمہارا کافی وقت ضائع ہوگیا ہے۔

نرگس نے اٹھ کر اس کے ہاتھ تھام لئے۔

آپ میرے وقت کا فکر نہ کیجئے۔ بیٹھ جائیے اتنی جلدی بھی کیا ہے۔

شمیم نے خواب گاہ سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

نہیں چلتا ہوں۔ مجھے خود ایک ضروری کام بھی ہے۔

نرگس روکتی رہ گئی۔ لیکن وہ بڑی تیزی سے باہر نکل گیا۔

نرگس کے کمرہ سے نکل کر شمیم عمارت کی سیڑھیاں اترنے ہی لگا تھا کہ پانچ، سات غنڈے اس کا راستہ روک کر کھڑے ہوگئے پھر ان میں ایک آگے بڑھا اور شمیم کا گریبان پکڑ کر زور سے کھینچتے ہوئے کہا۔

بڑے ہی سخت جان اور ڈھیٹ ہو۔ تمہیں کل مار مار کر باہر پھینک دیا آج پھر آن گھسے یہاں۔

شمیم مسکرایا اور دائیں ہاتھ کا ایک ایسا سخت گھونسہ اس کی ٹھوڑی کے نیچے مارا کہ وہ ہوا میں اچھل کر سیڑھیوں سے نیچے جا گرا۔

پھر وہ زخمی چیتے کی طرح اس کے دوسرے ساتھیوں پر حملہ آور ہوا اور تھوڑی ہی دیر میں سب کا مار مار کر بھرکس نکالتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے پھینک دیا وہیں کھڑے

ہو کر اس نے اپنا لباس درست کیا پھر ایک ہی جست میں سیڑھیوں سے نیچے کود کر لڑکھڑاتا ہوا عمارت سے باہر نکل گیا۔

۲۳

شمیم کے دوبارہ غائب ہو جانے پر سمیرا اور زیادہ سوگوار اور غمزدہ نظر آنے لگی۔ وہ ہر وقت اپنے کمرے میں پڑی سوچوں میں ڈوبی رہتی۔ خورشید اور پروین اسے اپنے ہاں لے گئیں۔

لیکن۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں۔

آخر سمیرا کی ناسازیٔ طبع کے باعث تنویر بھی تحمینہ اور نائلہ کو لے کر سندھ سے گھر چلی آئی۔ سمیرا کے پاس ہفتہ میں دو تین بار ضرور اس کو دیکھ جاتے۔ چچا حالانکہ سندھ میں بے حد مصروف تھے لیکن وہ بھی گاہے گاہے آ کر اسے تسلی دیتے رہے۔

گرما کی ایک چلچلاتی دوپہر خورشید اور پروین ڈرائنگ روم میں ریڈیو آن کئے دوپہر کی فرمائش سن رہی تھیں۔ ان کے سامنے ایک دوسرے صوفہ پر تحمینہ اور نائلہ بھی بیٹھی ہوئی

تھیں ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتے ہوئے پرسوز نغمے گونج رہے تھے۔

تنویر اپنے کمرے میں تھی۔ اور اس کے سامنے کرسی پر رفیعہ بیٹھی ہوئی تھی۔ باہر برآمدے کی اوٹ میں سمیرا کھڑی شاید ان کی باتیں سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ کمرے میں پنکھے کی سرسراہٹ کے علاوہ مکمل خاموشی تھی رفیعہ کے چہرے سے یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کسی گہری سوچ میں پھنسی ہوئی ہو۔ جلد ہی اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور تقریباً رحم طلب نگاہوں سے تنویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تنویر! کیا فیصلہ کیا پھر

تنویر نے بھی اداسی سے کہا۔

میں نے تو اپنے فیصلے سے کل ہی آگاہ کر دیا تھا۔

رفیعہ کی آواز سے حسرت ٹپک رہی تھی۔

تو کیا تم ابھی تک اپنے کل والے فیصلے پر قائم ہو۔

میں مجبور ہوں رفیعہ! سمیرا کی شادی ندیم سے کسی صورت میں بھی نہیں ہو سکتی۔

سوچ لو ندیم کی زندگی کا سوال ہے۔

لیکن دوسری طرف سمیرا کی بھی زندگی کا مسئلہ ہے۔

آخر اسے ایک دن شادی تو کرنا ہی ہو گی شمیم تو جانے کہاں غائب ہو چکا ہے۔ پورے خاندان نے تلاش کیا۔ لیکن کہیں بھی تو نہیں ملا۔

اسے گھر سے نکالنے کا سارا الزام بھی تو آپ پر ہی ہے نا۔

وہ کیوں۔

نہ انجم اور ندیم اس سے نارواسلوک رکھتے نہ وہ گھر سے بھاگتا۔

یہ تو میں ہی جانتی ہوں مجھے جیسے وہ ہیں ایسا ہی شمیم بھی ہے میں اسی بات پر کئی بار انہیں زجر و توبیخ بھی کر چکی ہوں۔

لیکن اب ایسا کرنے سے کیا فائدہ جو ہونا تھا ہو چکا۔ شمیم اب بے چارہ پتہ نہیں کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھا رہا ہے لیکن اب تو سارا گناہ اسی کا ہے۔

تنویر کے لئے یہ بات باعث اشتعال طبع ثابت ہوئی ذرا تلخ ہو کر پوچھا۔

وہ کیسے؟

جب سمیرا نے ہسپتال میں ایک دفعہ اس کی ساری غلط فہمیاں دور کر دی تھیں۔ پھر اس طرح غائب ہونے کا کیا مطلب اس سے تو صاف ظاہر ہے کہ سمیرا سے اب وہ شادی نہیں چاہتا۔

یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ وہ ہمارے ایک ایک دشمن سے انتقام لے رہا ہے اور اسے لینا چاہیے۔ اینٹ کا جواب پتھر ہی ہوتا ہے۔ لیکن میرے ندیم کا کیا ہو گا۔ تمہارے انکار سے تو وہ بیمار پڑ جائے گا۔

کچھ بھی نہیں ہو گا۔ ماشاء اللہ ڈاکٹر ہے۔ کسی اچھی جگہ شادی کر ڈالو۔ خود سنبھل جائے گا۔

تو کیا سمیرا کو شمیم کے انتظار میں اسی طرح بیٹھائے رکھو گی۔

تنویر نے روندھی ہوئی آواز میں کہا۔

میرے بس میں ہو تو آج ہی اس کی شادی کر دوں۔ لیکن وہ تو عمر بھر شمیم کا انتظار کرنے کا تہیہ کر چکی ہے۔

رفیعہ خاموش ہوگئی۔ تنویر بھی کچھ سوچنے لگی۔

کمرہ ایک بار پھر خاموشی میں ڈوب گیا۔

ناگاہ ریڈیو سے نغمہ تبدیل ہوا اور ملکہ ترنم کی آواز پورے گھر میں گونجنے لگی۔

مورے من کے راجہ آجا صورتیا دکھا جا۔

آجا نگر تمہاری ہے۔

شمیم کے ذکر سے سمیرا کا دل پہلے ہی پسا جا رہا تھا۔ اب اس نغمے کے بول نے ایسا تاثر پیدا کیا کہ وہ پردے کی اوٹ میں زار زار رونے لگی۔ اسی لمحہ کمرے سے باہر گلی میں کسی کار کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ سمیرا نے جلدی جلدی آنسو پونچھ ڈالے اور پردے کی اوٹ میں سے اس نے جو جھانک کر باہر دیکھا تو وہ مجاہد تھا۔ کار گلی میں کھڑی کر کے وہ برداشتہ خاطر سا کمرے کے بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر بے رونقی اور بھیگا پن تھا۔ سمیرا اس کی یہ حالت دیکھ کر کانپ گئی۔ تنویر کی بھی حالت کچھ ایسی ہی تھی۔ فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر مجاہد کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

کیا بات ہے بیٹا۔ شمیم کا کچھ پتہ چلا۔

مجاہد نے غمگین سے لہجے میں کہا۔

ہاں امی۔ ملا تھا لیکن ۔۔۔!

تنویر نے بے چینی سے اس کی بات کاٹی۔

جلدی کہو مجاہد۔ کہاں ہے میرا بیٹا۔

سمیرا کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔

مجاہد پھر بولا۔

امی مجھے وہ ایک کلب کے پاس پانچ چھ آدمیوں سے لڑتا ہوا ملا تھا۔ کسی نے اس کے سر پر چاقو بھی مارا ہوا تھا۔ اور اس کی ساری آستین خون سے تر تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے حریفوں کو بری طرح مار رہا تھا۔ میں تیزی سے بھاگ کر اس کی طرف بڑھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہاں سے کھسک گیا۔ اور ایک گلی میں ایسا روپوش ہوا۔ کہ کئی گھنٹے تلاش کے باوجود بھی اس کا کہیں سراغ نہ ملا امی اس نے پھر وہی راستہ اختیار کر لیا ہے وہ پھر قمار بازی اور آوارہ گردی میں پھنس گیا ہے۔

تنویر نے تاسف سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بیٹا۔ تم نے بھاگ کر پکڑ لیا ہوتا اسے۔!

امی میں بہت بھاگا لیکن وہ شہر کی ایک ایک گلی سے واقف دکھائی دیتا ہے۔ کون سی گلی میں گھس گیا تنویر اور کچھ کہنے ہی والی تھی کہ کمرے کے باہر فرش پر گرنے کی آواز سنائی دی۔ مجاہد اور تنویر لپک کر باہر آئے۔ رفیعہ بھی ان کے پیچھے باہر آگئی۔

کمرے سے باہر دروازے کے پاس سمیرا فرش پر بے ہوش پڑی تھی تنویر جھکا آگے بڑھ کر سمیرا کا سر ہلاتے ہوئے بولی۔

سمیرا! ہوش میں آؤ بیٹی کیا ہو گیا ہے تمہیں۔!

لیکن سمیرا اسی طرح بے حس پڑی رہی۔

اب تو اور زیادہ بدحواس ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے

آخر مجاہد بھاگ کر پانی کا گلاس بھر لایا اور سمیرا کے چہرے پر آہستہ آہستہ چھینٹے دینے لگا۔!

ڈرائینگ روم سے خورشید، پروین، تحمینہ اور ناظرہ بھی بھاگتی ہوئی وہاں آگئیں اور سب پریشانی سے فرش پر لیٹی ہوئی سمیرا کی طرف دیکھنے لگیں۔

پانی کے چھینٹوں سے سمیرا نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں اور تنویر کو اپنے پاس دیکھ کر بولی۔

بچی جان! وہ ... وہ ...!

تنویر نے اُسے تسلی دی۔

کچھ بھی نہیں ہوا بیٹی ... اٹھو چلو اپنے کمرے میں۔

سمیرا اٹھ کھڑی ہوئی اور تنویر اسے سہارا دے کر اس کے کمرے کی طرف لے گئی باقی سب افراد بھی گردنیں جھکائے دونوں کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

تسلیم لگاتار کئی دنوں تک عصمت کو تلاش کرتا رہا۔ لیکن جمال اور عبدل
لے کر کہیں ایسے غائب ہوئے کہ دوبارہ باوجود کوشش کے کہیں بھی نظر نہ آئے۔
نے پے در پے ناکامیوں کے باوجود تلاش جاری رکھی۔ ایک روز وہ میکلوڈ روڈ
ک سینما کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ فلم کے ایک اشتہار کی طرف دیکھ کر وہ ششدر
مختلف رنگوں میں وہاں بالکل عصمت کی شکل کا ایک ڈانس پوز تھا۔
سیم کچھ الجھن میں پڑ گیا۔ کافی دیر تک وہ اشتہار کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر اپنا شبہ
نے کی خاطر وہ سینما میں داخل ہوا اور فلم کے اصل پوسٹر دیکھنے لگا۔ وہاں بھی
ان کی تصویریں تھیں۔

سیم ایک اور خلش میں ڈوب کر رہ گیا۔ تھکے تھکے سے قدم اٹھاتے ہوئے وہ

سینما کے باہر نکل کر سڑک کے کنارے کچھ تھوڑا فاصلہ ہی آگے بڑھا تھا کہ کسی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی

بچئے ۔ !

شمیم نے دفعتہً سر دائیں طرف گھماتے ہوئے دیکھا تو وہی لڑکا جسے اس نے ایک دفعہ پولیس کے سپاہی سے بچایا تھا۔ ایک ضعیف اور دبلے پتلے بوڑھے کا ہاتھ تھامے ایک ڈاکٹر کی دوکان سے باہر نکل رہا تھا۔

شمیم نے اس کی طرف دیکھتے ہی زبردستی مسکرا کر کہا۔

کہو شاہین کیسے ہو۔ کہاں گھوم رہے ہو آج ؟

شمیم سے کچھ کہنے کے بجائے شاہین اس بوڑھے سے سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا بابا یہی ہیں وہ جنہوں نے اس دن مجھے اتنے ڈھیر سارے روپے دے دیئے تھے۔

شمیم وہیں کھڑا رہا۔ شاہین سیڑھیاں اتر کر اس کے قریب کھڑے ہو کر بولا۔

یہ میرے بابا ہیں۔ ان کی آنکھیں کچھ خراب ہیں۔ آج ڈاکٹر کے پاس لے کر آیا تھا۔

شمیم نے بڑے ادب سے اسے سلام کیا۔

اور وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

میرا نام ناظر ہے۔ تم اس دن شاہین کو اتنا روپیہ دے کر کہاں غائب ہو گئے۔ کم از کم نام اور پتہ ہی بتا دیا ہوتا شاید میں کبھی حاضر ہو کر احسان شناسی کا اظہار ہی کر سکتا۔

شمیم نے مسکرا کر کہا۔

نام کا جہاں تک تعلق ہے۔ مجھے شمیم کہتے ہیں۔ رہا سوال احسان کا تو میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا میرے پاس روپیہ ایسے ہی پڑا ہوا تھا مجھے اس کی کوئی چنداں ضرورت بھی نہ تھی۔ آپ کو اس وقت ضرورت تھی لہٰذا وہ صحیح مصرف میں آ گیا۔

کچھ بھی ہو شمیم پھر بھی تمہارا ہم پر بہت بڑا احسان ہے۔

شمیم بات کا رخ بدلنے لگا۔

اچھا چھوڑیئے ایسی باتوں کو۔ ابھی آپ جائیں گے کدھر۔

گھر۔

کہاں۔

مصری شاہ۔

شاہین نے آگے بڑھ کر شمیم کا ہاتھ پکڑ لیا۔

شمیم بھائی۔ آج میں آپ کو اپنے گھر لے کر جاؤں گا۔

شمیم ٹالنے لگا۔

نہیں شاہین۔ آج مجھے ایک ضروری کام ہے۔ پھر کبھی آؤں گا۔

شاہین مچل گیا۔

جھوٹ آپ کو تو ہمارے گھر کا پتہ ہی نہیں کدھر ہے پھر آپ۔ اکیلے کیسے آئیں گے۔

شمیم ہار مان گیا۔

اچھا ٹھہرو میں تمہیں ٹیکسی میں چھوڑ آتا ہوں۔ ساتھ ہی تمہارا گھر بھی دیکھ آؤں گا۔

شاہین کچھ کہنے کے لئے منہ کھولتا ہی رہ گیا۔ شمیم نے فوراً آگے بڑھ کر ایک ٹیکسی روکی دونوں کے ساتھ مصری شاہ روانہ ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ٹیکسی ایک صاف ستھرے مکان کے رکی۔

شمیم تو ٹیکسی والے کو کرایہ دینے لگا اور شاہین نے اپنے گھر کے دروازے پر دستک دینا شروع کر دی۔ شمیم ابھی ٹیکسی کے پاس ہی کھڑا تھا کہ کسی لڑکی نے دروازہ کھولا اور پھر دروازے کی اوٹ میں ہو گئی۔

شمیم نے اونچی آواز میں شاہین کی طرف دیکھتے ہوئے سے کہا۔

شاہین۔ میں اب چلا۔ پھر کسی دن آؤں گا۔ اچھا۔

شاہین نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

نہیں بھیا۔ میں نہیں جانے دوں گا۔ آپ کو۔ آیئے میرے ساتھ۔

ارے اب تو میں نے تمہارا گھر دیکھ لیا ہے۔ وعدہ کرتا ہوں بھئی ضرور آؤں گا۔

اس دفعہ ناظر بڑے پیار سے بولا۔

ضد نہ کرو بیٹا۔ زیادہ نہیں تو تھوڑی دیر بیٹھ کر ہی چلے جانا۔

اتنی دیر میں مکان سے ایک اور نوجوان لڑکی نکلی اور دروازے کی اوٹ میں ہو کر تھوڑی دیر بڑے غور سے شمیم کو دیکھنے کے بعد بھاگ کر باہر آئی اور شمیم بھیا کہتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔ شمیم اسے دیکھتے ہی حیران رہ گیا۔ وہ نازلی تھی۔ ناظر اور شاہین بھی حیران رہ گئے۔

شمیم پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

نازلی! تم یہاں کیسے؟

نازلی نے بڑے شوق سے شمیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بھیا یہ ہمارا گھر ہے۔ یہ میرے بابا ہیں۔ اور شاہین میرا بیٹا ہے۔

شمیم کسی سوچ پڑ گیا۔

نازلی اس کا ہاتھ کھینچ کر اندر لے جاتے ہوئے بولی۔

بھیا! آیئے نا۔ آپ اس طرح باہر کیوں کھڑے ہو گئے۔

شمیم اندر داخل ہوا دروازے کی اوٹ میں ایک اور چھوٹی سی لڑکی کھڑی تھی۔

نازلی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بھیا: یہ میری چھوٹی بہن مینا ہے۔

شمیم اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا آگے نکل گیا۔ سب ایک چھوٹے سے کمرے میں جا بیٹھے جس میں صرف ایک چھوٹے سے میز اور کرسی کے علاوہ دو چارپائیوں پر صاف ستھرے بستر بچھے ہوئے تھے۔

نازلی شمیم کے سامنے بیٹھی ہوئی بولی۔

کیا پیئیں گے بھیا! چائے یا ٹھنڈا۔

شمیم نے مسکرا کر کہا۔

نہ چائے نہ ٹھنڈا۔

کیوں۔

بس۔

بھائی اب اور تکلف نہ کیجئے۔ یہ آپ کی بہن کا گھر ہے۔

میں جانتا ہوں۔

- پھر بولیے نا -

ضروری ہے کیا۔

بالکل -

تو پھر چائے ہی پلا دو۔

نازلی نے فوراً اپنی چھوٹی بہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

مینا اٹھو چائے بنا کر لاؤ۔ کل کی طرح آج بھی اگر خراب چائے پکائی تو سخت مار پڑے گی۔

مینا چپ چاپ اٹھ کر باہر چلی گئی۔

نازلی نے اس دفعہ ناظر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بابا۔ یہ وہی شمیم ہیں۔ جن کے ہاں میں ملازم تھی اور جنہوں نے ایک دفعہ مجھے انجم اور ندیم کے ہاتھوں۔

ناظر نے فوراً اس کی بات کاٹ دی۔

میں سمجھ چکا ہوں بیٹی۔ شمیم کے لگاتار احسان نے میری گردن اور جھکا دی ہے۔

شمیم نے کمال التفات اور مروت سے کہا۔

کیوں بار بار مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔

ٹھیک ہی تو کہتے ہیں بابا۔ نازلی نے لقمہ دیا۔ بھیا آپ اگر ایسی باتیں نہیں سننا چاہتے تو یہ بتائیے آج کل آپ کون سے ہسپتال میں کام کرتے اور ہاں اب آپ نے لباس کیسا پہننا شروع کر دیا ہے۔ پہلے تو آپ نے کبھی ایسے کپڑے نہ پہنے تھے۔ نازلی سے شمیم کے آوارہ گردی

کے لباس پر تنقید کی۔

شمیم نے خاموش رہ کر کچھ سوچا۔ پھر اپنی ساری داستان تفصیلاً اسے سنا ڈالی۔

نازلی مغموم ہو گئی اور بھرائے لہجے میں کہا۔

"بہت برا ہوا یہ تو بھائی جان آپ نے تو اپنی زندگی خراب کر لی۔"

اتنی دیر میں مینا چائے کی ٹرے لے آئی۔ بات چیت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور سب خاموشی سے چائے پینے لگے۔

چائے کی پیالی ختم کرتے ہوئے شمیم اٹھ کھڑا ہوا اور نازلی کی طرف دیکھ کر کہا۔

اچھا نازلی۔ میں چلتا ہوں۔

بیٹھ جائیے نا بھائی جان۔ اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ نازلی کی آواز میں درد اور سوز تھا۔

نہیں اب چلتا ہوں پھر کبھی آؤں گا۔

کب آئیں گے پھر۔؟

بس اب تو آتا ہی رہوں گا۔

روزانہ آنا پڑے گا بھائی جان۔

نہیں نازلی روزانہ نہیں ہفتے میں ایک دو چکر ضرور لگایا کروں گا۔ اور ہاں بابا کی آنکھوں کا علاج اب کہیں سے نہ کرانا۔ میں کل محمود کو لا کر ان کی آنکھیں دکھا کر کوئی مناسب دوا تجویز کروں گا۔

سچ بھائی جان! نازلی کی نگاہوں میں اشتیاق کی چمک تھی۔

ہاں ہاں! میں بھلا جھوٹ کیوں بولنے لگا۔

تو پھر کل آپ آئیں گے نا۔

ضرور۔

شمیم واپس مڑتا ہوا مکان سے باہر نکل گیا اور نازلی چائے کے برتن سمیٹنے لگی۔

دن رات کروٹیں بدلتے رہے۔ وقت کسی کے لئے نشاط و سرور اور کسی کے لئے آہوں آنسوؤں کی سیج بچھاتا ہوا آگے ہی بڑھتا رہا۔ شمیم نازلی کے ہاں اکثر آتا رہتا۔ اس کی پڑھت سنی اور بے مثال علاج سے ناظر کی آنکھیں ٹھیک ہو گئیں۔ لیکن اس کا اپنا درد اور غم ویسے کا ویسا ہی تھا اور اس اجنبی شہر میں کوئی بھی تو اس کا پرسان حال نہ تھا۔

عصمت کے لئے وہ اسی طرح سارا سارا دن دیوانوں کی طرح لاہور کی وسیع سڑکوں اور تنگ گلیوں تک میں بھٹکتا رہا۔ لیکن اس کو کچھ اس طرح روپوش کر دیا گیا تھا جیسے بے آب و گیاہ صحرا میں دور سے نظر آتا ہوا سراب نزدیک پہنچنے پر ایک دم نظروں سے اوجھل ہو گیا ہو۔ شمیم کی شوریدگی روز بروز بڑھتی ہی رہی۔

دن بھر ناکام تلاش کے بعد وہ ساری لبریت جوا کھیل کر دور کرتا۔ رات بارہ بارہ اور دو دو بجے تک لاہور کے باہر اور چالاک قمار بازوں میں بیٹھا انہیں اس فن میں مات دیتا رہتا۔ ان گنت بار اس کا شہر کے کئی غنڈوں سے جھگڑا ہوا۔ کئی بار اس پر خنجروں سے خوفناک وار کئے گئے۔ لیکن وہ بھی اب سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن چکا تھا۔ ہر آدمی کے وار کا جواب اپنے تیز اور وحشت خیز خنجر کی چمکتی ہوئی نوک سے دیتا۔

سارے شہر میں اس کا کوئی ہمدم یا غمگسار تھا تو وہ تھا۔ اس کا ایک دوست ریاض

جو اس کا ہم پیشہ بھی تھا اور ہم طبع بھی۔ اس کے ساتھ وہ بھی ہر وقت عصمت کی تلاش میں رہتا تاکہ اپنے دوست کے دکھوں کا خاتمہ کر دے لیکن اب تک دونوں کی ہر کوشش لاحاصل ہی تو تھی۔ ریاض نے کئی بار شمیم کی خاطر اپنے جسم پر چاقو کے خطرناک وار لئے لیکن دوستی کے مضبوط رشتے پر کبھی دھبہ نہ آنے دیا۔

نازلی سے ملاقات کو آنے کی وجہ سے شمیم ان کے گھر میں ایک کا اضافہ ہو گیا تھا۔ شہر میں گھوم گھوم کر جب کبھی اس کی طبیعت اُکتا جاتی تو وہ سکون کی تلاش میں وہ اپنی اس منہ بولی بہن کے ہاں چلا جاتا اس کے ہاتھ کا بنا ہوا چائے کا ایک کپ وقتی طور پر اس کے سارے غم دھو ڈالتا۔

نازلی ایک روز اپنے باورچی خانہ میں بیٹھی کھانا پکا رہی تھی کہ شمیم صحن میں داخل ہوا۔ اس کی قمیض کا گریبان پھٹا ہوا تھا اور کپڑوں پر کچھ اس طرح گرد تھی جیسے ابھی ابھی کسی زبردست طوفان سے گزر کر آیا ہو۔ شمیم کو اس حالت میں دیکھ کر نازلی کے دل میں درد کی ایک ناقابل برداشت ٹھیس سی اٹھی۔ کھانا پکانا وہ بھول گئی فوراً آگے بڑھ کر شمیم کا راستہ روکتے ہوئے پوچھا۔

شمیم بھائی کیا بات ہے۔ جھگڑا ہوا کسی کے ساتھ۔

شمیم جو اپنے ہی خیالات میں غرق تھا فوراً متوجہ ہوا۔

نہیں تو!

یہ اپنی قمیض دیکھی آپ نے، نازلی نے پھٹے ہوئے گریبان کی طرف اشارہ کیا۔

شمیم خجالت میں ڈوب گیا۔

اوہ۔ تو کیا ہوا۔ غریب آدمی ہوں۔

نازلی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

بھیا۔

شمیم نے بات کا رخ ہی بدل ڈالا۔

اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ بابا کہاں ہیں۔

اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں۔

تم کیا کر رہی ہو۔

کھانا پکا رہی ہوں۔

جلدی کرو پھر۔ زور کی بھوک لگ رہی ہے۔

آپ بابا کے پاس جا کر بیٹھئے۔ میں ابھی لائی کھانا۔

نازلی باورچی خانے میں گھس گئی اور شمیم غلطاں و پیچاں آگے بڑھتا ہوا ناظر کے پاس جا بیٹھا۔ دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے پھر شمیم نے ناظر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بابا! ایک بات کہو؟

ناظر کا لہجہ شفقت آمیز تھا۔

کہو بیٹا! مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔

برا نہ مانیئے گا۔ میں جو کچھ کہوں گا نازلی کے بھائی کی حیثیت سے کہوں گا۔

تم کہو تو سہی۔ میں کیوں برا ماننے لگا۔

بابا! نازلی کے ہاتھ پیلے کر دینے چاہئیں۔

ناظر کسی سوچ میں پڑ گیا۔

کیا سوچنے لگے بابا!

بیٹا! ابھی اس کام میں کچھ مجبوریاں حائل ہیں۔

وہ کیا مجھے بھی تو پتہ چلے۔

تم نے جو پانچ ہزار دیا تھا۔ میرا ارادہ تھا اس سے نازلی کو بیاہ دوں گا۔ محلے ہی ایک آدمی رشتہ بھی پوچھ چکا ہے لڑکا میٹرک ہے اور کسی فرم میں کلرک ہے۔ لیکن نازلی نے اس روپے سے لوگوں کا قرض چکانے کے بعد باقی روپے سے ایک گرا ہوا کمرہ چڑھا لیا ہے۔ اب میں پھر ویسے کا ویسا ہو کر رہ گیا ہوں۔

کمرے کے دروازے کی اوٹ میں نازلی یہ ساری باتیں سن رہی تھی۔

شمیم بولا۔

کیا نازلی وہاں شادی پر رضامند ہے۔

ہاں میں نے مینا کو اس سے پوچھنے کے لئے کہا تھا۔ اُسے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تو پھر دیر کاہے کی لڑکے والوں سے مل کر شادی کے دن مقرر کر لیجئے۔

کیسی باتیں کرتے ہو بیٹا۔

کیوں؟

شادی کے لئے اتنی جلدی روپیہ کہاں سے آئے گا۔

آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔ نازلی کا بھائی زندہ ہے۔ وہ اپنی بہن کے معاملے میں شرمندہ نہیں ہونے دے گا۔

شمیم نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو سو کے دس ہزار نوٹوں کی گڈی نکال کر ناظر کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ یہ لیجئے دس ہزار روپیہ۔ اب تو کوئی مجبوری نہ رہیگی

ناظر کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

دس ہزار روپیہ۔ نہیں نہیں میں اس قدر بوجھ برداشت نہ کر سکوں گا۔

آپ پر کیسا بوجھ ہوگا۔ بہن کی خاطر بھائی کی یہ ایک معمولی سی قربانی ہے

ناظر سوچنے لگا۔

نازلی بھاگتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور گڈی اٹھا کر گود میں رکھتے ہوئے کہا۔

نہیں بھائی جان۔ بہن بھائی کی زندگی ویران کر کے اپنی خوشیوں کا محل تعمیر نہیں کرنا چاہتی۔

شمیم نے سختی سے کہا۔

نازلی ایسے موقعوں پر باپ اور بھائی کی باتوں میں دخل نہیں دیا کرتے کیا میں تمہارا بھائی نہیں۔ کیا ایسا کرنا میرا فرض نہیں۔

چپ کیوں ہو جواب دو نا۔ کیا تم مجھے لوگوں سے یہ طعنہ سنوانا چاہتی ہو کہ شمیم کی بہن...

نازلی فوراً شمیم سے لپٹ گئی۔ اور اس کی چھاتی پر سر رکھ کر زار زار رونے لگی

بھیا! اس حالت میں تو تمہیں ہم پر بوجھ ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن .... لیکن ہم تم پر بوجھ بن کر رہ گئے ہیں۔

بھیا! تم ... تم انسان نہیں فرشتہ ہو۔

شمیم نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

ہش پگلی! بہن بھائی پر کیا بوجھ ہوتی ہے۔ اس سے بڑھ کر میرے لئے اور کیا خوشی ہوگی کہ تم یہاں سے باعزت رخصت ہو کر اپنی نئی اور پرسکون زندگی کا آغاز کرو گی۔

لیکن بھیا!

لیکن ویکن کچھ نہیں اٹھو جاؤ باہر۔

نازلی حیرانگی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

شمیم نے پھر اسی انداز میں کہا۔

ارے میری طرف کیا دیکھ رہی ہو۔ اٹھو نا۔ کھانا تو کھلا دو سچ سخت بھوک لگ رہی ہے۔

نازلی مسکرا پڑی۔ اور فوراً اٹھ کر باہر چلی گئی۔

اس کے باہر جانے کے بعد شاہین اور مینا بھی وہیں آ گئے نازلی نے سب کے لئے کھانے کے برتن رکھے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد سب کھانا کھانے میں مشغول ہو گئے اور نازلی شمیم کے قریب بیٹھ کر پنکھا ہلانے لگی۔

نازلی کی شادی کے بعد شمیم نے ان کے ہاں آنا بہت کم کر دیا تھا۔ اب اُس کے صرف دو ہی ٹھکانے تھے۔ دفتر، عصمت کی تلاش میں سرگرداں رہنا اور رات رات وہ تمام بازی کے اڈوں پر گزار دینا۔

وہ ایک بھیانک اور اندھیری رات تھی۔ شمیم مال روڈ پر قمار بازی کے ایک اڈے سے نکلا اور بس اسٹاپ پر آکر کھڑا ہو گیا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک کی گہما گہمی اور شور ختم ہو چکا تھا۔ صرف کبھی کبھی کوئی کاریا سامان سے لدا ہوا ٹرک گزر جاتا اور سنسان پرسکون کو تھوڑی دیر توڑتا اور نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔

رات کا آنچل بڑی تیزی سے بھیگتا رہا۔ چمن زاروں میں شبنم اور کلیوں کے درمیان شوخی پھیلتی رہی مرغ بیمر پھولوں کی آغوش میں لینے کے لئے اٹھلانے لگے۔ لیکن منہ کلیاں مستی کے عالم میں اِدھر اُدھر بھٹکنے لگیں جیسے۔

وہ کسی کی بے قرار اور پیاسی آغوش میں سمٹ جانے کے لئے بے چین ہو گئی ہوں۔
جلد ہی شبنم کی دھندلاہٹ گہری ہو کر پودوں کے پتوں پر قطروں کی شکل اختیار کر گئی۔
پھر قطرے مسکراتے ہوئے کلیوں پر گرنے لگے۔
کلیاں کسمسائیں۔
تلملائیں۔
لیکن جنس مخالف کی شوخیاں بڑھتی گئیں۔
گرفت مضبوط ہوتی چلی گئی۔
کلیوں کا نازک جسم کانپا۔ تھرتھرایا۔ آخر انہوں نے جذبات سے مغلوب اور خندہ ہاں۔
غریب کی طرح اپنا منہ کھول دیا اور شبنم کے قطرے ساری رات شب زفاف کی رنگینی
لذت سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

شمیم بس اسٹاپ پر کھڑا خیالات میں غرق تھا کہ ایک ٹیکسی اس کے پاس آکر رکی اور
اس کے کھڑکی سے سر باہر نکالتے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔
"ہے سٹر! جاؤ گے کہیں۔"
"ہاں ہاں! خیالات سے چونک کر شمیم نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔
"کہاں چلو گے۔"
شمیم نے اُسے کلب کا پتہ بتا دیا۔
ڈرائیور نے کار کا دروازہ کھول دیا۔
"پھر آؤ گے۔ کیا سوچ رہے ہو۔"

شمیم آگے بڑھ کر اندر بیٹھ گیا اور ٹیکسی بڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگی۔

ابھی بمشکل ایک فرلانگ فاصلہ ہی طے ہوا تھا کہ ڈرائیور نے اپنی ٹیکسی سڑک کے بائیں طرف کھڑی ایک دوسری ٹیکسی کے قریب روک لی۔ شمیم ابھی کچھ سمجھنے بھی نہ پایا تھا کہ اُس ٹیکسی سے جمال اترا اور شمیم کے پیچھے بیٹھ کر پستول کی نالی اس کی پیٹھ پر رکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں بولا۔

خبردار جو شور کرنے کی کوشش کی۔

شمیم نے دوسری ٹیکسی کی طرف بغور دیکھا۔ اس میں ڈرائیور کے ساتھ عبدل بھی بیٹھا تھا۔

وہ سب کچھ سمجھ گیا اور اپنا رخ پیچھے کی سمت کرتے ہوئے جمال کی طرف دیکھ کر کہا۔

کیا چاہتے ہو تم۔

جمال کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ ڈرائیور نے اپنے دائیں ہاتھ کی ایک پائیدار ضرب شمیم کی گردن پر لگائی غصے سے اس کا چہرہ تپتا گیا۔۔۔ قبل اس کے کہ وہ ڈرائیور سے دو ڈرائیور سے دوہاتھ کرتا جمال پستول کی نالی پھر اس کی پیٹ پر تھی۔

سامنے دیکھو ورنہ۔۔۔

شمیم چہرے پر زہریلی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے سامنے دیکھنے لگا۔

دونوں ٹیکسیاں شہر سے باہر نکلیں اور شاہدرہ سے کوئی چھ میل آگے نکل کر شاہراہ چھوڑ کر ریت پر چلے لگیں کوئی پندرہ منٹ کے سفر کے بعد دونوں ٹیکسیاں شیشم، ببول اور سرکنڈا کے ایک گھنے جنگل میں رک گئیں جمال نے پسٹل کے بٹ سے شمیم کے پیٹ پر ٹھوکر لگائی ہوتے اسے نیچے اترنے کے لئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی نیچے اترنے لگا۔

شمیم نے صرف ایک لحظہ تک اس کی طرف چور نگاہوں سے دیکھا پھر بلک جھپکنے ہر نکلا اور دوسرے لمحے اس نے جمال کا ہاتھ پکڑ کر بار بار پستول کا ٹریگر دباتے ے ساری گولیاں ہوا میں فائر کر ڈالیں سارا جنگل مسلسل فائرنگ سے گونج اٹھا۔ عبدل ں ایک لمبا چاقو اور دونوں ڈرائیور ہاتھوں میں ہینڈل پکڑے شمیم کی طرف بھاگے۔ تا اتنی دیر تک اس نے جمال کے سر اور گردن پر پستل کے بٹ کی مضبوط ضربیں لگاتے ے اسے اندھے مذریت پر گرا دیا تھا۔ پھر وہ پستل پھینکنے کے بعد ایک طرف ہٹ ڑا ہو گیا۔

تینوں آدمی اس کے قریب ہوئے شمیم نیچے جھکا اور جس ڈرائیور نے ٹیکسی میں ال گردن پر گھونسہ رسید کیا تھا اس کی آنکھوں میں ریت جھونک دی۔ پھر بڑی پھرتی آگے بڑھ کر اس سے ہینڈل چھین لیا۔ اور اسی سے اس کی مرمت کر ڈالی۔ ڈرائیور تے ہوئے ریت پر گر گیا۔

عبدل اور دوسرا ڈرائیور اس پر ٹوٹ پڑے۔ لیکن شمیم نے انہیں بھی دم نہ لینے دیا۔ گھماتے ہوئے پوری قوت سے عبدل کے ہاتھ پر دے مارا اس کا چاقو چھوٹ کر ا اور وہ اپنا ہاتھ سہلانے لگا۔ شمیم اب دوسرے ڈرائیور کو بُری طرح پیٹنے لگا ساتھ ہی ساتھ کبھی کبھی عبدل کے بھی ہینڈل دے مارتا۔ جلد ہی دونوں اس کے ے بھاگ نکلے۔ اتنی دیر تک جمال بھی اٹھ چکا تھا شمیم نے اُسے بھی اپنی لپیٹ لیا اور بڑی تیزی سے ہینڈل گھما گھما کر سناٹے میں آن پر برساتے ہوئے سب ل نکال دیئے۔

تینوں تھوڑی دیر اس کے سامنے حملے کی ناکام کوشش کے بعد بڑی تیزی سے ایک طرف بھاگتے ہوئے۔ سرکنڈوں میں گھس کر نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ شمیم دوبارہ پہلے ڈرائیور کی طرف بڑھا وہ ابھی تک ریت پر بیٹھا اپنی آنکھیں صاف کر رہا تھا۔ شمیم نے اسے بالوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور اسے گاڑی میں بیٹھنے کے لئے کہا اس نے کچھ پس و پیش سے کام لیا شمیم نے ایک مضبوط مکہ اس کے پیٹ پر مارا۔ ڈرائیور کئی بل کھاتا ہوا گاڑی کے ٹائر کے اوپر جا گرا شمیم پھر اُسے پاؤں کی ٹھوکر لگاتے ہوئے روز سے دھاڑا۔

"میں کہتا ہوں اٹھ کر گاڑی میں بیٹھو۔ اور چلو واپس۔ نہیں تو تمہیں جان سے مار کر گڑھا خود واپس لے جاؤں گا ڈرائیور کانپتا ہوا گاڑی میں گھسا۔ شمیم بھی اس کے پاس بیٹھ گیا اور ٹیکسی بڑی تیزی سے شہر کے رُخ پر بھاگنے لگی۔

کلب کے باہر شمیم نے ٹیکسی رکوائی اور ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تم جال کو کیسے جانتے ہو۔

ڈرائیور کسی انجانے خوف سے کانپنے لگا تھا۔

وہ میرا دوست ہے۔

شمیم کا غصہ چڑھنے لگا۔

کہاں رہتا ہے وہ۔

ڈرائیور نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اس کی رہائش کا مجھے کوئی علم نہیں۔

شمیم نے کچھ سوچ کر پھر سلسلہ کلام شروع کیا۔

تم نے ٹیکسی میں مجھے مکہ کیوں مارا تھا۔

ڈرائیور خاموش رہا۔ تاہم خوف سے اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوگئے۔

شمیم نے پھر اُسے چونکا کر رکھ دیا۔

نیچے اترو۔

بائیں۔ اس نے کمال وحشت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

شمیم تلخ ہو کر زور سے گرجا۔

میں نے کہا۔ جلدی نیچے اترو۔

ڈرائیور کانپتا ہوا نیچے اترا۔

شمیم اس کا بازو پکڑ کر فٹ پاتھ پر لے آیا۔ اور ایک طاقت ور گھونسہ اس کے جبڑے پر ثبت کرتے ہوئے زور سے غرایا۔

ادلے کا بدلہ۔

پھر تین چار گھونسے لگاتار اسے رسید کرنے کے بعد اسی انداز میں کہا۔

اور

اور یہ تمہاری غلطی کا جرمانہ

ڈرائیور فٹ پاتھ پر لوٹنے لگا۔ اور شمیم کلب میں گھس گیا۔

دوسرے روز شام سے کچھ قبل کلب کے کمرے میں کرسی پر اداس بیٹھا تھا کہ کمرے میں داخل ہوا۔ شمیم کو ایسی حالت میں اداس پڑے دیکھ کر وہ بے چین

ہوگیا اور آگے بڑھ کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

شمیم کیا وجہ ہے۔ آج غمگین کیوں ہو۔

جھوٹ کیوں بولتے ہو۔ تمہارے چہرے کی پھیکی مسکراہٹ سب کچھ بتا رہی ہے۔

کیا بتا رہی ہے۔

یہی کہ تمہارا موڈ کچھ خراب ہے۔

کچھ بھی نہیں۔ سب تمہاری نگاہوں کا دھوکہ ہے۔

چھپاتے کیوں ہو۔ سچ سچ کیوں نہیں کہہ دیتے کیا گھر یاد آ رہا ہے۔

نہیں۔

تو پھر عصمت کی یاد ستا رہی ہوگی۔

شمیم نے کچھ نہ کہا۔ اس کی نگاہیں آب گوں ہوگئی تھیں۔

ریاض سب کچھ سمجھ گیا۔ لیکن پھر بھی بات کی گہرائی تک جانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

شمیم! جلدی بتاؤ۔ پھر تمہیں خوش خبری سناتا ہوں۔

شمیم نے دل گرفتگی کے عالم میں پوچھا۔

کیا بتاؤں؟

اپنی پریشانی کی وجہ۔

کوئی وجہ نہیں۔ تم نے جو کچھ کہنا ہے جلدی کہو۔

ایسے نہیں۔ پہلے تم بتاؤ۔

شمیم نے مختصر سا جواب دیا۔

اچھا پھر رہنے دو۔ میں تو۔

اس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔

ریاض نے اس کے شانے ہلاتے ہوئے کہا۔

اگر تم نہیں بتانا چاہتے تو نہ سہی۔ سنو میں تمہیں خوشخبری سناتا ہوں۔

شمیم نے آنکھیں کھول دیں اور غور سے ریاض کی طرف دیکھنے لگا۔

ریاض نے کسی خوشی کے زیر اثر مسکرا کر کہا۔

وہ جمال اور بعدل۔

شمیم فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

ہاں ہاں! کہو کیا بات ہے۔

وہ دونوں آج یہاں آ رہے ہیں۔

شمیم نے متحس نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بات کو اور آگے بڑھایا۔

تمہیں کہاں ملے وہ

ریاض کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

کہیں بھی نہیں۔

پھر تم۔

ہاں ہاں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ وہ صفدر لڑکا جو یہاں جوا کھیلنے آتا ہے نا۔ وہ ان کو اچھی طرح جانتا ہے اس کے علاوہ اس نے ان کی رہائش کا کھوج بھی لگا لیا ہے

اس نے میرے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ وہ ان دونوں کو جوا کھیلنے کے بہانے یہاں لائے گا۔ اس طرح ہم دونوں ان کی مرمت کرنے کے ساتھ ساتھ عصمت کا بھی پتہ لگائیں گے۔

شمیم کا چہرہ مسرت امید سے تمتما اٹھا۔

کب آئیں گے۔

آج ہی شام کے بعد۔

شمیم آگے بڑھ کر ریاض سے لپٹ گیا۔

ریاض تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔

پھر اُس نے اس کے گال اور پیشانی پر بوسوں کی بارش کر دی۔

ریاض نے بھی اپنے بازو اس کے بدن کے گرد حمائل کر دیئے۔

۲۶

فائٹس کلب کا کمرہ نمبر ۴ آج قمار بازوں سے خالی تھا۔ صرف شمیم کمرے کے وسط میں دروازے کی طرف پشت کئے ایک دوسری میں پھنسی ہوئی ریشمی تاروں کے سے خیالات میں الجھا ہوا بیٹھا تھا۔ ریاض نیچے بڑے ہال میں بڑی بے چینی سے جمال اور عبدال کا انتظار کر رہا تھا۔

رات بڑی تیزی سے تاریکیوں میں ڈوبتی جا رہی تھی اور غریب لوگ اپنے گھروں میں دبک کر محو استراحت تھے لیکن امیر!

امیروں کی تو اصل زندگی ہی رات کی رنگینیوں میں ہے جب شراب خانے پر وشنیوں سے جگمگا اٹھتے ہیں۔ عیاشیوں کے خفیہ اڈے اور کلب رنگ و بو۔ رقص و شباب اور حسینوں کے جذبات میں ڈوبے ہوئے جنسی جسم کی نمائش گاہ بن کر امارت کے ٹھیکیداروں کی آسائش

سکون اور حبس میں ڈوبے ہوئے بھڑکیلے جذبات کی پیاس بجھانے کا سامان مہیا کرتے ہیں اور پھر ایسا کیوں نہ ہو۔ دولت ہی تو سب کچھ ہے۔

کلبوں اور میخانوں میں عورت نہیں دولت ناچتی ہے اور یہ بھی دولت ہی ہے جس کے لالچ میں عورت اپنا جسم تک بیچ ڈالتی ہے۔ لیکن اس کا ضمیر منع کرنا تو کجا اس سے باز پرس تک نہیں کرتا۔ اور ضمیر بے چارہ کرے بھی کیا دولت اس کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتی ہے۔

رات کا ہر لمحہ دراز ہوتا ہوا آنچل پھیلانا شروع ہو چکا تھا اور کسی کونے سے گیارہ کی گھنٹیاں سنائی دیں۔ فضاؤں میں تھوڑی ویران کی آوازیں گونجتی رہیں۔ لیکن جلد ہی مہیب اور سناٹا خاموشی فضاؤں کو نگل گئی۔ ہاں میخانوں نائٹ کلبوں اور قہوہ خانوں میں روشنی اور زیادہ چمکتے ہوئے حسین چہروں کے رقص و شباب کی وجہ سے گہما گہمی ضرور تھی۔

شمیم اسی طرح سوچ و بچار میں غرق بیٹھا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ریاض جمال اور عبدل کے ساتھ اندر داخل ہوا شمیم اپنے سامنے قد آدم آئینے میں تینوں کو دیکھ چکا تھا جانے کیا سوچتے ہوئے اس نے اپنا سر میز پر ٹکاتے ہوئے اپنے دونوں بازوؤں میں چھپا لیا۔

ریاض نے ان دونوں کو شمیم کے سامنے لا کھڑا کیا وہ اپنے آپ اس پر سکون اور ویران کمرے میں پا کر حیرت کی نگاہوں سے ریاض کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ شمیم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

جمال اور عبدل کے چہرے پر خوف ہراس طاری ہو گیا۔

دوسری طرف شمیم کے چہرے پہ درندگی اور خونخواری برسنے لگی۔

جمال اور عبدل کانپنے لگے۔

جلد ہی شمیم کی سخت اور ترش آواز نے انہیں چونکا دیا۔

تم دونوں نے کئی بار بھیڑیوں کے روپ میں مجھ پر حملہ کیا۔ لیکن تنگ آمد کے مداق جب میں بھی تمہاری طرح بے رحمی کا لبادہ اوڑھ کر تمہارے تعاقب میں نکلا تم دونوں روپوش ہو گئے۔ آج حالات نے تمہیں میری کچھار میں لا کھڑا کیا ہے اب ہراس کے۔ میں اپنی دیوانگی اور وحشت کا اظہار کروں۔ صاف صاف کہہ دو کہ مت کہاں ہے۔ انکار کی صورت میں اسی کمرے کا فرش تم دونوں کے خون سے رنگوا لوں گا۔

جمال اور عبدل دیدۂ ویران سے ایک دوسرے کی طرف اس طرح دیکھنے لگے جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہے ہوں۔ کہاں آ پھنسے۔

شمیم انہیں خاموش دیکھ کر زور سے غرایا۔

خاموش کیوں ہو۔ بولتے کیوں نہیں کہاں ہے عصمت؟

انہوں نے پھر خاموشی کا سہارا لیا۔

لیکن شمیم جب خونخوار نگاہوں سے انہیں دیکھتا ہوا آگے بڑھا۔ تو جمال خوف سے کانپنے لگا اور رک رک کر کہا۔

وہ ... وہ ... اسے تو ہمارے ہاں سے گئے ہوئے کئی ماہ ہو گئے۔

شمیم نے زیر خنداں کرتے ہوئے پوچھا۔

کہاں چلی گئی۔

وہ آج کل فلموں میں کام کر رہی ہے۔

فلموں میں۔ شمیم کے لہجے میں حیرت تھی۔

ہاں۔ وہ ایک فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں روزانہ شاہ نور اسٹوڈیو جاتی ہے۔

اس وقت کہاں ملے گی۔

وہیں اسٹوڈیو میں۔

شمیم کا لہجہ ترش ہوتا جا رہا تھا۔

تم دونوں کا کاروبار کیا ہے۔

جمال نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

فلموں کے لئے ایکسٹرا لڑکیاں سپلائی کرنا۔

اور کچھ۔

جب تک انہیں فلموں میں کام نہیں ملتا۔ بطور رقاصہ نائٹ کلبوں اور اس طرح کے دوسرے اڈوں میں پیش کرتے ہیں۔

شمیم کا غصہ اب برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ فوراً ہی۔ اس نے بات کا رخ بدلا اور اصل موضوع کی طرف آیا۔

تم نے عصمت کو کیوں اغوا کیا۔

جمال نے کانپتے ہوئے بڑی عاجزی سے کہا۔

ہمیں معلوم نہ تھا کہ وہ تمہاری بیوی ہے۔

جھوٹ بکو اس تمہیں سب کچھ پتہ تھا۔ تم نے جان بوجھ کر میری زندگی جہنم میں

لیلی ہے۔ تمہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں تم لوگ معاشرے کے صاف ستھرے جسم ایک گندہ ناسور ہو تمہیں ... تمہیں ...

پھر اس نے اچانک آگے بڑھ کر دونوں پر گھونسوں اور پاؤں کی ناقابل برداشت ٹھوکروں کی بوچھاڑ سی کر دی جمال اور عبدل اپنے دفاع کی کوشش کئے بغیر بری طرح پٹتے رہے۔ شمیم بھی شاہد آج اپنا پورا غصہ اور کوفت اتارنے کا تہیہ کر چکا تھا اس نے دونوں کو بری طرح مکے لگاتے ہوئے نڈھال کر کے رکھ دیا۔ عبدل اب بے سدھ ہو چکا تھا اور فرش پر لیٹ کر ہانپنے لگا۔

جمال بھی بار بار شمیم کی آہنی ضرب پڑتے ہی فرش پر گر جاتا۔ لیکن ہر بار شمیم اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھاتا اور ایک خوفناک گھونسا اس کے جبڑوں پر رسید کرتے ہوئے مزید زندگی میں اور اضافہ کر دیتا۔

جمال پر اب اس قدر نقاہت طاری ہو چکی تھی کہ وہ بے ہوش ہوتا نظر آ رہا تھا۔ عبدل بھاگ کر آگے بڑھا اور شمیم سے اس کا گریبان چھڑاتے ہوئے کہا۔

شمیم چھوڑ دو اب۔ مر جائے گا بیچارا۔

شمیم نے خون بار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ہٹ جاؤ ریاض! اب ان دونوں کو مجھ سے موت ہی چھڑائے گی۔

لیکن ریاض نے شمیم کو کھینچ کر پیچھے ہٹایا اور دو تین تھپڑ جمال کے منہ پر مارتے ہوئے کہا۔

کمینے، مکار، نیچ، بھاگ جاؤ یہاں سے ورنہ جان سے مار ڈالے گا۔

جمال اور عبدل بھاگتے ہوئے باہر نکل گئے۔

ریاض نے شمیم کو پکڑ کر کرسی پر لا بٹھایا۔ کچھ دیر وہ اس کے پاس خاموش کھڑے رہنے کے بعد بولا۔

شمیم! چلو! اسٹوڈیو چلیں۔ شاید عصمت بھی وہیں مل جائے۔

شمیم چپ چاپ اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں باہر سڑک پر آئے اور پھر ٹیکسی میں اسٹوڈیو روانہ ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ ملتان روڈ پر اترے اور بڑی تیزی سے اسٹوڈیو میں گھس گئے۔ باہر فضاؤں میں گپ اندھیرا تھا۔ لیکن اسٹوڈیو کے اندر بجلی کے سینکڑوں قمقمے اور خوشی میں رقصاں حسین اور جوان لڑکیوں کے چہرے ایک نئی زندگی کی راہ دکھا رہے تھے۔

شمیم ریاض کے ساتھ مختلف فلموں کے سیٹ پر سے ہوتا ہوا جب ایک جگہ لوگوں کی بھیڑ کے پاس رکا تو دنگ سا رہ گیا۔ عصمت لکڑی کے سیٹ پر تو بہ شکن انگڑائیاں لیتی ہوئی محوِ رقص تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ اور جسم کے ہر عضو میں مل کر موہ لینے والی تھرتھراہٹ تھی اور۔

اس کا فوق البرق لباس نگاہوں کو خیرہ کر رہا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر شمیم کا سارا بدن لرز اٹھا اور وہ لکڑی کے ستون کا سہارا لے کر اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا ذہن طرح طرح کے خیالات سے چکرانے لگا۔

بھاگ جاؤ یہاں سے۔

اس کے ذہن کی آواز تھی۔

وہ اپنی اس زندگی میں خوش ہے۔ تم اس کے سامنے آ کر اس کی خوشیوں میں ناسور کی سی پرانی یادوں کی دیوار کھڑی نہ کرو۔

بھاگ جاؤ اسے اب اس کے حال پر چھوڑ دو۔

شمیم پیچھے ہٹنے ہی والا تھا کہ اس کے ضمیر نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

بزدل ہو تم کہاں جانے لگے ہو۔ وہ تمہاری بیوی ہے۔ تمہارا اس کا ایک مقدس رشتہ ہے۔ پھر اس راستے پر چلنے میں اس کا دوش بھی کیا۔ کیا تمہاری اتنے ماہ کی تلاش کا یہی نتیجہ ہو گا کہ تم اسے اس حال میں چھوڑ کر فرار ہو جاؤ ہمت کرو آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لو۔ ڈر کاہے کا۔ آخر وہ تمہاری بیوی ہی تو ہے۔

شمیم اپنے سر کو ہلکا سا جھٹکا دے کر چند قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ عصمت کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ اس نے فوراً چھلانگ لگائی اور "شمیم شمیم" پکارتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔ شمیم کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور عصمت اس کی چھاتی پر سر رکھے زار و قطار رونے لگی۔

سیٹ کے گرد و پیش کھڑے سب تماشائی اس منظر پر دم بخود رہ گئے۔ جلد ہی عصمت نے ان کی پریشانی میں اضافہ کر دیا وہ شمیم کا ہاتھ پکڑ کر قریب ہی کھڑی ہوئی اپنی کار میں جا بیٹھی۔ تماشائی دیکھتے رہ گئے۔ اور کار اسٹوڈیو سے باہر نکل گئی۔

ماڈل ٹاؤن کی ایک عالی شان کوٹھی کے پورچ میں عصمت نے کار روکی اور شمیم کے ساتھ ایک پُرتکلف ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ دونوں ایک ہی صوفہ پر بیٹھ گئے۔ شمیم نے اسے اپنی گود میں ڈھیر کرتے کہا۔

عصمت تم۔

لیکن عصمت نے کچھ کسمسا کر علیحدہ ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

شمیم اب میں۔

وہ کچھ سوچ کر رک گئی۔ اور پھر دیوانہ وار شمیم سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

شمیم اس کی اس حرکت کو سمجھنے سے قاصر رہا۔

عصمت تھوڑی دیر بعد اٹھی۔ اور اپنے آنسو پونچھتے ہوئے شمیم کی طرف دیکھ کر کہا۔

شمیم تھوڑی دیر بیٹھو میں ابھی آئی۔

شمیم نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔

کہاں چلی ہو۔

میں ذرا اپنے کمرے میں ہو آؤں۔

میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔

نہیں شمیم تم بیٹھو۔ میں لباس تبدیل کر آؤں۔

شمیم بچوں کی سی ضد کرنے لگا۔

اوں ہوں۔ میں بھی ساتھ چلوں گا۔

کچھ سوچ کر عصمت کی آنکھیں پھر آنسو بہانے لگیں اور اس نے نہایت پیار سے انداز میں شمیم کی گردن کے گرد اپنے بازو حمائل کرتے ہوئے کہا۔

شمی! اچھی جان نہیں؟! بیٹھو نا۔ میں دیر نہیں لگاؤں گی۔

شمیم خاموش ہو گیا۔

اور عصمت لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکل گئی۔

شمیم کو ڈرائنگ روم میں انتظار کرتے کرتے دس منٹ گزر گئے۔ پھر سوئی پندرہ اور بیس منٹ بتانے لگی شمیم بار بار اپنی کلائی دیکھتا لیکن عصمت ابھی تک نہ لوٹی تھی وہ اکیلے اور بدمزگی سی محسوس کرنے لگا۔ تنگ آ کر وہ اٹھا اور ادھر ادھر مختلف کمروں میں دیکھتے ہوئے عصمت کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ صوفے پر گھٹڑی بنی تھی۔ شمیم نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے جب اس کا چہرہ پکڑ کر اوپر اٹھایا تو متحیر ہو کر رہ گیا۔ عصمت موت سے ہم آغوش ہو کر عالم برزخ کو سدھار چکی تھی۔ شمیم اسے جھنجھوڑتے ہوئے پکارنے لگا۔

عصمت میری طرف دیکھو۔ عصمت۔

لیکن جواب کون دیتا۔ عصمت تو موت سے بغلگیر ہو کر بے حس ہو چکی تھی۔

شمیم بڑی بے بسی سے بڑبڑایا۔

تو کیا عصمت مر گئی۔

کیا میری اتنے عرصے کی تلاش کا یہی انجام تھا۔

کیا... کیا...؟

وہ آشفتگی میں ڈوب کر رہ گیا۔

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ پریشان ہو کر جو اس نے ادھر ادھر دیکھا اس کی نگاہ سامنے میز پر پڑے ہوئے ایک کاغذ پر پڑی۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھا اور کاغذ اٹھا کر پڑھنے لگا۔

عصمت کا اس کے نام خط تھا۔

سرتاج :۔

میری خودکشی کی موت کا آپ کو صدمہ تو بہت ہوگا۔ مجھے آفت خیز حالات نے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ سرتاج آپ ایک دفعہ جب میرے تعاقب میں جمال کے ساتھ ریلوے لائن پر دست و گریبان ہوئے تھے اس وقت کوئی آدمی گاڑی کے نیچے آگیا تھا۔ جمال نے مجھے کہا تھا کہ شمیم گاڑی کے نیچے آکر ختم ہوگیا ہے۔ میں نے بھی اس خبر کو سچا سمجھ لیا۔ کیونکہ اس موقع پر آپ کے علاوہ کوئی اور آدمی موجود نہ تھا۔ اور دوسرے دن اخبار میں بھی یہ خبر چھپی کہ "ایک آدمی گاڑی کے نیچے آگیا۔ لیکن لاش پہچانی نہ جاسکی۔

اس واقعہ کے بعد میں نے کئی بار خودکشی کی کوشش کی لیکن سر بار ناکام رہی اور زندگی مجھے تلخ حالات کے پرخار راستوں پر گھسیٹتی رہی۔ میں نے جمال کے پاس سے بھاگ جانا چاہا۔ لیکن کبھی کامیاب نہ ہوسکی۔ جمال نے مجھے کچھ عرصہ اپنے پاس رکھا۔ اس درمیان میں میری عصمت کو کئی بار لوٹا گیا اور انجام کار۔ مجھے رقاصہ کے روپ میں پیش کر دیا۔

پھر مجھے فلم کے ایک ہدایت کار کے حوالے کر دیا گیا یہاں میں آزاد تھی اور اگر چاہتی تو گھر واپس بھی جاسکتی تھی۔ لیکن میں جاتی بھی تو کون سا منہ لے کر بے ننگ و ناموس اور بے آبرو ہونے کے بعد تو وہاں جاکر میں آپ اور خاندان کے لئے بدنما داغ بن کر رہ جاتی۔

یہ نیا ماحول پہلے سے کچھ اچھا تھا۔ یہاں کم از کم میری عزت تو محفوظ تھی۔ پھر وہ منحوس دن بھی آیا کہ اس نئے مالک نے کچھ اس انداز سے میرے ساتھ شادی کی پیش کش کی کہ میں انکار نہ کرسکی اور اس سے شادی کر لی۔ آپ کی موت کا یقین ہوجانے کے بعد میں دربدر

کی خاک چھاننے کے بجائے فلم کے اس ہدایت کار سے شادی کرنے پر مجبور ہوگئی۔ اب آپ کی اچانک آمد سے مجھے اپنی زندگی کی اس عظیم غلطی اور گناہ کا احساس ہوا ہے۔ میں نے آپ کے ساتھ جفا کی ہے۔ سرتاج! مجھے اب زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔

میری ان سب پیچیدگیوں کا حل صرف موت ہے۔ اور وہ بھی بھیانک موت۔

میں اپنے گناہوں کے سبب آپ سے کسی آخری خواہش کی حقدار تو نہیں۔ پھر بھی میری یہ آخری آرزو ہے کہ آپ بہت جلد شادی کرلیں۔ ہوسکتا ہے اس طرح میری روح کو بھی سکون میسر ہو۔

شمیم! مجھ سے بڑھ کر کون بدنصیب ہوگا۔ جس کے ہاتھ سے آپ جیسے شستہ و رفتہ شوہر کا دامن چھوٹ گیا۔

موت سے ہمکنار عصمت۔

شمیم کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ خط اس نے پھر میز پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر کھڑے ہوکر بڑی حسرت سے عصمت کو دیکھتا رہا۔ پھر کمرے سے باہر نکلا لڑکھڑاتے قدموں سے کوٹھی کا صحن عبور کرکے سڑک پر آیا اور پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے منزل سے بے خبر فٹ پاتھ پر چلنے لگا زیست اب پھر مشکل پڑ گئی تھی۔

دور گلبرگ کی کسی کوٹھی میں شاید شادی کی کسی تقریب کی وجہ سے اتنی رات گئے ریکارڈنگ ہو رہی تھی اور یہ بول فضا میں بکھر رہے تھے۔

اشکوں سے لکھ رہے ہیں افسانہ زندگی کا
بنتا نہیں سہارا کوئی یہاں کسی کا

شمیم کی آنکھیں آنسوؤں کا دریا بہانے لگیں اور گانے کے اس پر درد اور سرگرم تاثر سے دور بھاگنے کے لئے اس نے اپنی رفتار پہلے سے تیز کر دی۔

۲۷

اسی رات کے پچھلے پہر شمیم ٹرین سے کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح لاہور سے نکلا اور دوسرے روز صبح سویرے شکستہ دل اور سقیم الحال اس مسافر کی طرح گھر داخل ہوا جس کے پاس دانت کریدنے کو تنکا تک نہ رہ گیا ہو۔ عالیہ لان میں بیٹھی۔ اخبار پڑھ رہی تھی۔ شمیم کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اخبار بند کرتے ہوئے پوچھا۔

شمیم بھائی کہاں رہے اتنا عرصہ آپ نے تو اپنی خیریت کی اطلاع بھی نہ دی۔

شمیم نے کوئی جواب نہ دیا خاموشی سے آگے بڑھ کر برآمدے میں داخل ہو گیا۔

عالیہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

شمیم جب ڈرائنگ روم میں داخل ہونے لگا تو عالیہ نے پھر مخاطب کیا۔

عصمت باجی کہاں ہے بھیا!

شمیم ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور صوفے پر بیٹھ کر ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

عالیہ سہم گئی۔

بھائی جان! خاموش کیوں ہیں۔ کچھ بولئے تو۔

شمیم نے آہستہ آہستہ اپنا سر اوپر اٹھا کر کہا۔

عالیہ! عصمت اب کبھی یہاں نہیں آئے گی۔

عالیہ کے ہاتھ سے اخبار چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔

کیوں بھائی جان! کیوں نہیں آئے گی۔

اس نے خودکشی کر لی ہے۔

بھیا! عالیہ صوفے پر بیٹھ کر رونے لگی۔

کچھ دیر تک کمرے میں عالیہ کی سسکیاں بلند ہوتی رہیں۔ اس درمیان میں شمیم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

عالیہ!

عالیہ سسکیوں کی گہرائی سے بولی۔

جی۔

امی کہاں ہیں۔

عالیہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

وہ ... وہ تو۔

میم نے اس کی ڈھارس بندھائی۔

کہو عالیہ چپ کیوں ہو گئیں۔

بھائی جان! آپ اور عصمت کے اچانک غائب ہو جانے کے بعد وہ کچھ عرصہ بیمار پڑی رہیں۔ میں نے کافی علاج معالجہ کرایا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا اور مرض بڑھتا رہا۔ پھر ایک دن وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئیں۔

شمیم نے اپنی پیشانی ہاتھ کی ہتھیلی پر ٹکاتے ہوئے ایک سرد نالہ سرکر کے کہا۔

اف۔ پورے کا پورا گھر تباہ ہو گیا۔ اب یہاں ذہنی پریشانیوں کے سوا رہ بھی کیا گیا ہے۔

ڈرائنگ روم میں کافی دیر خاموش بیٹھے رہنے کے بعد شمیم نے اٹھ کر غسل کیا اور کپڑے تبدیل کر کے بازار گھومنے چلا گیا۔ اور پھر رات اس نے ذہنی تفکرات کانٹوں پر لوٹتے ہوئے گزار دی۔

اگلے روز سے عصمت کا کلینک شمیم کے نام سے چلنے لگا۔ عالیہ اور فوزیہ۔ پھر اسی طرح کلینک میں نرس کا کام کرنے لگیں۔

شمیم ایک روز صبح ہی صبح کلینک کے سامنے اپنی کار کھڑی کرنے کے بعد باہر نکلا اور اندر داخل ہونے کے لئے ابھی کلینک کی چند ہی سیڑھیاں چڑھا تھا کہ پیچھے سے کسی نے اس کا شانہ پکڑ لیا۔ جونہی اس نے بدک کر پیچھے دیکھا سامنے اس کا بھائی انجم کھڑا تھا۔ دونوں بھائی تھوڑی دیر ایک دوسرے کو عجیب نظروں سے دیکھتے رہے پھر انجم نے آگے بڑھ کر شمیم کو بھینچتے ہوئے اپنے گلے لگا لیا۔ لیکن شمیم کچھ اجنبیت اور بے حسی کا اظہار کر رہا تھا۔

شمیم کو علیحدہ کرتے ہوئے انجم نے بڑے شوق سے مسکرا کر کہا۔

میری طرف دیکھو شمیم! میں ہو۔ تمہارا بھائی انجم۔

شمیم نے اپنے گلے میں لٹکتا ہوا سٹیتھ اسکوپ درست کرتے ہوئے کچھ اداس اور بے رخی کے ملے جلے جذبات سے کہا۔ پہچان چکا ہوں۔

انجم اس کے رویے کی پروا کئے بغیر پھر مسکراتے ہوئے کہا۔

کلینک کے سائن بورڈ پر تمہارا نام بھی لکھا ہوا ہے۔ حیرت ہے کہ کسی بار یہاں سے گزرنے کے باوجود میں تمہارا نام نہ پڑھ سکا۔ کتنے عرصے سے چلا رہے ہو یہ کلینک۔

تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں۔ شمیم نے مختصر سا جواب دیا۔

کار اپنی ہے کیا۔ انجم نے سیڑھیوں کے پاس کھڑی کار کی طرف اشارہ کیا۔

ہاں۔

آج کل بڑے آدمی ہو۔ ہم سے کھل کے کیونکر بات کرو گے۔

آپ چھوڑیئے ان باتوں کو مجھ سے کوئی کام ہے کیا۔

اتنے عرصے بعد ملنے کے باوجود بھی اس قدر بے رخی کا اظہار کر رہے ہو۔ میں مانتا ہوں تمہارے ساتھ میں نے بہت زیادتیاں کی ہیں۔ لیکن بھائی ہوں کیا تم مجھے... خیر چھوڑو آؤ اندر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ انجم اس کا ہاتھ پکڑ کر کلینک میں لے گیا۔

دونوں بھائی ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔

انجم نے مخاطب کرنے میں پہل کی۔

شمیم میں اپنی غلطیوں کی معافی مانگتا ہوں بڑا بھائی سمجھ کر ہی مجھے معاف کر دو۔

پھر اس نے نیچے جھک کر شمیم کے پاؤں چھونے کی کوشش کی۔

شمیم تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔

بھیا!

انجم مسکرا پڑا۔

چلو سکر ہے تم نے بھائی کہہ کر تو پکارا۔ میرے کان سے عرصے یہ لفظ سننے کو بیتاب تھے۔

شمیم نے پھر تلخ ہو کر پوچھا۔

آپ کیوں تنگ کرتے ہیں مجھ سے آخر چاہتے کیا ہیں آپ۔

انجم نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

بس ایک دفعہ میرے ساتھ چلو۔

کہاں۔

گھر۔ تنویر چچی تمہاری وجہ سے ہر وقت بے چین رہتی ہیں۔ اگر ان کی ایسی حالت رہی [illegible] بہت جلد بیمار پڑ جائیں گی۔

آپ انہیں مطمئن کر دیجئے گا ٹھیک ہو جائیں گی۔

لیکن اب انہیں تسلی دینا میرے بس کا روگ نہیں رہا۔

بس کہہ دیجئے گا شمیم مر چکا۔

انجم کے چہرے کا رنگ فوراً فق پڑ گیا۔ اور شمیم کے چہرے پر پیار سے ہلکی سی ایک [illegible] لگتے ہوئے کہا۔

شمیم! آئندہ ایسی بات کی تو یاد رکھو سخت مار پڑے گی۔

آپ جانیے میں پھر سے نئے جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہتا۔

انجم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا

میں کہتا ہوں اٹھو۔ نہیں تو تمہیں یہیں سے اٹھا کر گھر لے جاؤں گا۔

شمیم نے جھلا کر کہا۔

ضد نہیں کیا کرتے بھائی جان۔ آپ جانیے میں نہیں جاؤں گا۔

اتنی دیر میں عالیہ اندر آگئی۔ اور انجم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

آپ انہیں کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔

انجم حیرت سے شمیم کی طرف دیکھنے لگا۔

شمیم کو مجبوراً بولنا پڑا۔

بھائی جان! یہ میری نرس عالیہ ہے۔

اور پھر عالیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

عالیہ! یہ میرے بڑے بھائی انجم ہیں۔

عالیہ پھر بولی۔

لینے آئے ہوں اگے آپ کو۔

ہاں۔

تو جانیے ناضد کیوں کرتے ہیں۔

نہیں عالیہ میں نہیں جاؤں گا۔ شمیم نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

عالیہ نے اس دفعہ انجم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

انجم بھائی! انہیں ضرور اپنے ساتھ لے کر جائیے۔ یہ گھر پر بھی ہر وقت اداس پڑے رہتے ہیں۔

انجم اٹھ کھڑا ہوا اور شمیم کا بازو پکڑ کر اوپر اٹھاتے ہوئے بولا۔

اٹھو شمیم! جلدی کرو۔

دوسرا ہاتھ عالیہ پکڑ کر کھینچنے لگی۔

اٹھئے نا بھیا! بڑے بھائیوں کی بات ٹھکرایا نہیں کرتے۔

انجم نے پھر گرہ لگائی۔

شمیم اعالیہ جیسی بہن۔ اگر مجھے اٹھنے کے لئے اس طرح کہے نا تو سچ کہتا ہوں ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہ کروں۔ شمیم اٹھ کر اس کے ساتھ ہولیا۔

تنویر کے مکان سے باہر کار رکی اور انجم، شمیم کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ڈرائنگ روم میں نور شید اور پروین مشین پر بیٹھی کپڑے سلائی کر رہی تھیں۔ ان کے بائیں طرف تنویر احتیاط سے کپڑوں کی کٹائی میں مصروف تھی۔ اس کے قریب ہی تحمینہ اور کورس کتابیں پڑھ رہی تھی۔ اور ان سب کے سامنے سمیرا ایک علیحدہ صوفے پر بیٹھی گڑیا کا سویٹر بنتے ہوئے بڑی تیزی سے سلائیاں چلا رہی تھی۔

انجم جب شمیم کو لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ تو سب سے پہلے منور کی نگاہ اس پر پڑی خوشی سے بے قابو ہو کر اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی قینچی ایک طرف پھینک "میرا لال" "میرا بچہ" کہتی ہوئی شمیم سے لپٹ گئی۔ سمیرا کے لبوں پر کھنڈ توڑ مسکراہٹ

پھیل گئی اور نشاط میں اس کے ہاتھ سے سلائیاں اور سویٹر چھوٹ کر نیچے گر گیا۔

تنویر سے جدا ہونے کے بعد شمیم کی نظر جب سمیرا پر پڑی تو چکرا سا گیا۔

وہ سفید ریشمی ساڑھی اور سفید بلوز میں فتنہ سے قیامت بنی ہوئی تھی۔ وہی بھرا بھرا جسم جس کی طرب انگیزی شمیم ایک دفعہ محسوس بھی کر چکا تھا۔ وہی نگاہوں کو خیرہ کرنے والے چھاتیوں کے ابھار۔ سرخ سرخ عارض۔ گنار بازو اور لمبی سیاہ زلفیں۔

نہ جانے کیا وجہ تھی کہ جب دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں۔ سمیرا کے چہرے پر خشونت پھیل گئی اور وہ فرش پر پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔ منظر بڑا دل شکن تھا۔ شمیم کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اپنا رنگ جمانے لگے تو کیا سمیرا مجھ سے نفرت کرنے لگی۔

ابھی وہ انہی وہموں میں پھنسا ہوا تھا کہ خورشید بولی۔

بھائی جان ہمیں تو ہسپتال میں سخت دھوکا دے کر غائب ہو گئے تھے۔ جب تک لکیریں نکال کر معافی نہ مانگیں گے ہم تو ان کے پاس نہ بیٹھیں گے۔ پھر وہ بھی پروین کو ساتھ لے کر باہر نکل گئی۔ ہاں تحمینہ اور نائیلہ بری طرح شمیم سے لپٹ گئیں۔ تنویر نے شمیم کو اپنے پاس بٹھاتے ہوئے بغیر کسی تمہید کے شکوہ گزاری شروع کر دی

بیٹا! تم اتنا عرصہ غائب رہے۔ تم نے یہ بھی کبھی نہ سوچا گھر والوں کی کیا حالت ہو گی۔ اور ہاں۔ اب تو انجم سے کوئی ناراضگی نہیں رہی۔

انجم نے شکایتاً کہا۔

کہاں چچی جان! میرے ساتھ تو اس نے سیدھی منہ بات بھی نہیں کی۔

اچھا اٹھو۔ دونوں بھائی میرے سامنے گلے ملو۔ تنویر کے کہنے میں حکم کی سی جھلک تھی۔

دونوں بھائی اٹھ کھڑے ہوئے۔

انجم فوراً اٹھا اور بے غل و غش اس سے لپٹ گیا۔

شمیم نے پہلے کچھ تکلف برتا۔ پھر انجم کو اپنے ساتھ بھینچ لیا اور ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی پھیل گئی۔ ساری رنجش اور بدخواہی دھل گئی۔

دونوں بھائی جدا ہو کر پھر تنویر کے پاس بیٹھ گئے۔

شمیم نے کچھ سوچ کر کہا۔

چچی! اب میں چلتا ہوں۔ پھر آؤں گا۔

کہاں جاؤ گے تنویر کی آواز میں حیرت اور پریشانی تھی۔

انجم نے فوراً لقمہ دیا۔

چچی جان! یہ آج کل بہت بڑا کلینک چلا رہا ہے۔

کہاں۔

بڑے بازار میں

تنویر نے شمیم سے تفصیل چاہی

کیوں بیٹا یہ ٹھیک ہے کیا؟

جی ہاں۔ اب جانے دیجئے۔ صبح سویرے ہی مجھے چند مریضوں کو دیکھتے ان کے گھر جانا ہوتا ہے۔

مجھے تو اعتبار نہیں آتا بیٹا! تم چھل دے کر پھر کہیں غائب ہو جاؤ گے۔

آپ وہم نہ کیجئے میں شام کو ضرور آؤں گا۔

رہتے کہاں ہو۔

کچہری روڈ پر گورنمنٹ ہائی اسکول کے پاس ایک بہت بڑی دو منزلہ عمارت ہے۔ گیٹ پر میرے نام کا بورڈ بھی لگا ہوا ہے۔ وہی میرا مکان ہے۔

ہوں۔ تو آج کل بہت بڑے آدمی بن گئے ہو۔

اچھا چچی میں چلا۔ شمیم اٹھتے ہوئے بولا۔

تنویر کے ذہن میں فوراً کوئی خیال دوڑا۔ اور انجم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

انجم! جاؤ شمیم کے ساتھ۔

شمیم نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

کیوں چچی جان؟

مجھے اب تمہارا کوئی اعتبار نہیں رہا۔ جانے کب پھر کہاں غائب ہو جاؤ۔

شمیم مسکرا دیا۔ اور پھر دونوں بھائی ہاتھ میں ڈالے ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئے۔

تھوڑی دیر بعد خورشید اور پروین پھر ڈرائنگ میں آئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے سمیرا بھی تھی۔ شمیم کو تنویر کے پاس نہ دیکھ کر خورشید نے مستفسرانہ انداز سے پوچھا۔

امی شمیم بھائی کدھر گئے۔

تنویر نے پھر قینچی تھامتے ہوئے کہا۔

وہ یہاں اپنا کلینک چلاتا ہے بیٹی۔ صبح سویرے اس نے چند مریضوں کو دیکھنے جانا تھا۔ اس لئے چلا گیا ہے اب شام کو آئے گا۔

خورشید نے رنجیدگی سے کہا۔

کیوں جانے دیا آپ نے۔ ہم تو انہیں مذاق کرنے کے لئے ڈرائنگ روم سے لائی تھیں۔ اب وہ پھر نہیں آئیں گے۔

اب کے میں نے بندوبست کر کے بھیجا ہے۔

کیا کیا ہے آپ نے۔

انجم کو میں نے ساتھ بھیجا ہے۔ وہ شام کو اسے ساتھ لے کر آئے گا۔

خورشید مطمئن ہو کر مسرورانہ انداز سے جھوم گئی۔ سمیرا اور پروین کے چہروں پر بھی ویرانی کا رنگ دوڑ گیا۔

شام کو جب انجم شمیم کو لے کر گھر لوٹا تو سب افراد خوشی سے جھوم گئے۔ ڈرائنگ روم میں ایک محفل سی جم گئی۔ اور سب کافی دیر تک شمیم پر گلوں، شکووں کی بوچھاڑ کرتے رہے۔ شمیم کے کان ان کی طرف تھے لیکن آنکھیں کسی کی متلاشی تھیں۔ سمیرا کمرے میں نہ تھی۔ وہ بار بار سوچتا۔

وہ یہاں آ کر کیوں نہیں بیٹھی۔

کیا وہ مجھ سے نفرت کرنے لگی ہے۔

کیا اس نے محبت کے سارے بندھن توڑ دیئے ہیں۔

پھر اس کا ذہن خود ان باتوں کا جواب بھی پیش کر دیتا۔

ٹھیک ہی تو ہے۔ تمہارے اطوار کیا اس کے ساتھ محبت کا رشتہ قائم رکھنے کے تھے۔ تم نے تو اس پر ستم ظریفی کا ہر حربہ آزمایا لیکن وہ خاموش رہی تم نے کسی اور

کے رخسار و زلف کا سہارا لے لیا لیکن اس کے دل میں تمہاری محبت اسی طرح سلگتی رہی۔ اب اگر اس نے کوئی اور راستہ اختیار کر لیا ہے تو تم کیوں تاسف کرتے ہو۔

وہ تمہارا انتظار کرتی بھی۔

تو آخر کب تک۔

وہ بھی جوان ہے۔ حسین ہے۔ اور سب سے بڑھ کر تعلیمی زیور سے آراستہ بھی ہو سکتا ہے غم زیست اور داغ دل سے چھٹکارا کی خاطر اس نے کسی کے بازوؤں کا سہارا لے لیا ہو۔

شمیم ایسے وسوسوں کو جھٹک دیتا۔

نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔

لیکن خیالات پھر ہتھوڑوں کی طرح اس کے ذہن میں برسنے لگتے۔

کیوں نہیں ہو سکتا۔

برداشت کی بھی کوئی انتہا ہے۔

وہ کب تک تمہاری یادیں سینے سے لگائے بیٹھی رہتی۔

ان ناتمام خیالات کی ہیجان انگیزی کے باوجود شمیم بار بار دروازے کی طرف دیکھتا کہ شاید سمیرا اب آ جائے لیکن وہ در نا سفتہ صرف ایک بار اپنی جھلک دینے کے بعد ایسی غائب ہوئی کہ پھر کہیں نظر نہ آئی۔

کھانے کے بعد تنویر شمیم کو لے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اور باقی افراد ڈرائنگ میں کیرم بورڈ اور لوڈو کھیلنے لگے۔

تنویر کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ شمیم اس کے سامنے بیٹھا ناتراشیدہ سے خیالات کا مسکن بنا ہوا تھا کہ جانے تنویر کون سا موضوع چھیڑتی ہے۔ آخر تنویر بول ہی پڑی۔

شمیم بہت انتظار ہو چکا۔ میرا ارادہ ہے اب تم شادی کر لو۔

شمیم نے رسماً کہا۔

نہیں چچی اب میں اس جھنجال میں پڑنے کا نہیں۔

اب تو تمہیں اس میں پڑنا ہی ہوگا۔ میں نے ایک لڑکی بھی پسند کر رکھی ہے۔ اس کے والدین بھی مجھ سے رشتہ کی آمادگی کا اظہار کر چکے ہیں لڑکی کا نام عبیدہ ہے۔ بی اے تک پڑھی ہوئی ہے۔ اس سے بیشتر وہ تمہیں کہیں دیکھ بھی چکی ہے۔ اس نے خود بھی اپنی پسند کا اظہار کر دیا ہے۔ اور پھر کوئی اتنی دور کا بھی نہیں۔ یہی ہمارے ساتھ والے محلے میں وہ لوگ رہتے ہیں لڑکی کا جہاں تک تعلق ہے۔ وہ بے حد خوبصورت اور سلیقہ شعار ہے۔

شمیم کے ذہن میں سمیرا رقص کناں تھی۔ کسی اور لڑکی کا نام سن کر بیزاری سے بولا۔

کچھ بھی ہو چچی! میں اب شادی نہیں کروں گا۔

ایسی بدشگونی کی باتیں نہیں کیا کرتے بیٹا! صبح تمہارے جانے کے بعد میں نے خاندان کے سب افراد کو تمہاری شادی کی تار بھی ڈالی ہے۔ یہی نہیں لڑکی والوں سے میں نے رسم کا دن بھی مقرر کر آئی ہوں۔ اور محلے میں لڈو بھی بٹ گئے ہیں۔

تنویر نے تیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شمیم چلا پڑا۔

بہت بڑی غلطی کی آپ نے۔ میں شادی نہیں کروں گا۔ بالکل نہیں کروں گا۔

اب تو میری عزت کا سوال ہے شمیم!

شمیم کے اس جواب سے تنویر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

آخر چچی تھی نا۔

شمیم نے بھی اپنے اس ترش اور تلخ رویہ کو محسوس کیا اور خجالت سے سر جھکا لیا۔

خیالات نے پھر اس کا دامن تھام لیا۔

چچی میری شادی عبیدہ نامی کسی لڑکی سے کیوں کرنا چاہتی ہیں۔

کیا سمیرا نے انکار کر دیا۔

یا اس کی کہیں شادی ہو گئی ہے۔

چچی اس کا ذکر کیوں نہیں چھیڑتی۔ اس کا نام باتوں میں کیوں نہیں آتا۔

ذہن کا کوئی تاریک کونہ پکارا۔

خود پوچھ لو نا۔ کہاں ہے سمیرا۔

لیکن شمیم نے سر جھٹک کر ذہن کے اس تاریک کونے کے پٹ بند کر دیئے۔

نہیں نہیں یہ بے حیائی ہے۔ اگر وہ کسی کی ہو چکی ہے۔ تو میں اس کی خوشیوں میں دیوار کیوں بنوں۔ اور پھر میرا کیا ہے غم کا عادی ہو چکا ہوں۔ اتنے ڈھیر سے غموں میں ایک کا اضافہ اور سہی۔

تنویر نے اس کے اس کے خیالات منتشر کر دیئے۔

بیٹا میں نے سوچا کچھ تھا۔ لیکن تم کچھ اور ہی خیالات پر جمے بیٹھے ہو اگر ایسا نہ ہوا تو میری ناک کٹ جائے گی۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی۔

شمیم ہکلانے لگا۔

چچی جان! میں۔۔۔ میں اب۔۔۔

تنویر بیچ میں پھر بول۔

اب اس حجت تردیدی اور ٹیلے پن کو چھوڑو شمیم! صرف ایک بار میری خاطر ہاں کہہ دو۔

شمیم نے ایک بار غائرانہ نگاہوں سے تنویر کی طرف دیکھا پھر اپنا سر جھکاتے ہوئے کہیں دُور سے بولا۔

چچی جان! جس طرح آپ چاہتی ہیں کریں میں آپ کی خاطر سب کچھ برداشت کر لوں گا۔ تنویر خوشی سے جھوم ہی تو گئی فوراً اُٹھ کر شمیم کی پیشانی چوم لی۔

تین دن کچھ اس طرح گزر گئے کہ کچھ دن رات کا احساس تک نہ ہوا۔

چوتھے روز صبح سویرے شمیم کی شادی کی تیاریاں۔ شروع ہو گئیں۔ پورا خاندان شادی کی اس تقریب کو چار چاند لگانے کے لئے انتھک کوشش کر رہا تھا۔ آخر دوپہر ڈھلنے کے بعد شمیم دولہا بنا۔ بارات گئی اور جب اس کے سامنے دستخط کے لئے نکاح نامہ رکھا گیا۔ تو اس کے ذہن اور دل میں غم اور تاسف کا طوفان مچ گیا۔ دلہن کے خانے میں واقعی عبیدہ کا نام لکھا تھا۔

آخر شام ڈھلنے سے کچھ قبل بارات واپس لوٹی۔ خاندان کی سب جوان اور بوڑھی عورتیں دلہن پر سے نوٹوں کی گڈیاں وار وار کر پھینک رہی تھیں۔ شمیم اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ ان میں سمیرا کہیں دکھائی نہ دی۔ تو کیا سمیرا نے میری شادی میں شرکت بھی گوارہ نہ کی۔

شام ڈھل گئی۔ کھانے کے بعد خورشید اور پروین خاندان کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ

ڈرائنگ روم میں بیٹھیں شمیم کو مذاق کر رہی تھیں کہ تنویر اندر داخل ہوتی ہوئی بولی۔

پاگل ہو تم سب۔ چھوڑو اب شمیم کو۔ دلہن اپنے کمرے میں اکیلی پڑی انتظار کر رہی ہے۔

سب لڑکیاں خاموش ہو گئیں۔ تنویر شمیم کا بازو پکڑ کر باہر لائی۔ دو تین کمروں کے سامنے سے گزرنے کے بعد اس نے ایک کمرے کے سامنے رکتے ہوئے اسے اندر جانے کے کہا۔

تنویر آگے نکل گئی۔ شمیم کمرے میں داخل ہوا۔ اندر سے دروازے کی چٹخنی لگائی اور پھر کانپتی ہوئی ٹانگوں سے آگے بڑھنے لگا۔ کمرے میں خوابوں کا سا حسن اور نکھار تھا۔ فرش پر قیمتی قالین بچھا تھا۔ کھڑکیوں، دروازوں پر رنگین اور ریشمی پردے لٹک رہے تھے۔ ایک طرف پھولوں سے ڈھکے ہوئے۔ بڑے سے پلنگ پر دلہن شرم و لاج سے گٹھڑی بنی ہوئی بیٹھی تھی

شمیم آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ دلہن کی پٹی پر بیٹھ کر اس کا گھونگھٹ ہٹانے کے بعد جو اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ تو اس کے ذہن میں ہلچل سی مچ گئی۔ اس کے سامنے سمن اندام اور شمع رو سمیرا دلہن کے لباس میں آشوب روزگار اور فتنہ خوابیدہ بنی بیٹھی تھی۔ کچھ دیر کے لئے اس کی زبان گنگ ہو گئی آخر ہکلاتے ہوئے کہا۔

سمیرا تم!

سمیرا نے اپنی فتنہ زا آنکھیں اوپر اٹھا کر کہا۔

ہاں سرتاج

لیکن وہاں تو تمہارا نام عبیدہ لکھا ہوا تھا۔

کاغذات میں نام عبیدہ ہے سرتاج لیکن خاندان میں مجھے سمیرا کے نام سے پکارا

جاتا ہے۔

شمیم نے فرط شوق سے سمیرا کو اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔

میری اچھی سمیرا۔

سمیرا نہ کسمسائی نہ تلملائی۔ نہ ہی اپنے دفاع کی کوشش کی بس خاموشی سے اپنا لجلجا جسم شمیم کی گود میں ڈھیر کر دیا

اب وہ اس کی بیوی تھی نا۔

سارے حجاب ٹوٹ گئے۔ سمیرا کی آگ کی طرح دھکتی ہوئی جوانی کا مرمریں جسم شمیم کی گود میں پڑا انگڑائیاں لے رہا تھا۔ شمیم کا دل کا طوفان تھم چکا تھا۔ اس کے بازوؤں کی گرفت سمیرا کے جسم پر مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ سمیرا کے ہونٹوں پر تقدس میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ تھی۔

کمرہ رنگ و بو سے جھم جھمانے لگا۔ بہاریں رنگ برسانے لگیں۔ تھوڑی دیر دونوں جوان جسم ایک دوسرے کے تلذذ سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ پھر جذبات کی گہرائیوں میں ڈوبنے لگے مقاربت اور بڑھی دونوں جسموں کے درمیان رکاوٹیں ایک ایک کر کے ہٹ گئیں شب زفاف مچلی بہاروں نے اپنے چہرے چھپا لئے۔ رات طلسمات میں ڈوب گئی۔ شہنائیاں ایک ایک کر کے ٹوٹ گئیں۔ دوشیزگی سسکنے لگی۔ بہاروں نے صباحت کے پیراہن مسکراتے ہوئے منہ کھول دیتے۔ اور

کمرے میں سہاگ رات کی بو باس پھیل گئی۔

اسلم راہی

اقبال گنج، گجرات